دوسری صدی ہجری میں لکھی گئی
ایک سائنسی کتاب

توحید مفضل

توحید پرستوں کے لیے علم کا لازوال خزانہ

1

موضوع: انسان

سائنسی تشریحات
محمد علی سید



یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ھیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ھیں.



منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدرآباد پاکستان





۷۸۶
۱۱۰-۹۲
یا صاحب الزماں ادرکنی



لبیک یا حسینؑ

خصوصی تعاون: نذر عباس
رضوان رضوی

اسلامی کتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری ۔

SABIL-E-SAKINA
Unit#8,
Latifabad Hyderabad
Sindh, Pakistan.
www.sabeelesakina.page.tl
sabeelesakina@gmail.com

دوسری صدی ھجری میں لکھی گئی ایک سائنسی کتاب



توحید پرستوں کے لیے علم کا لازوال خزانہ

پہلی بار سائنسی تشریحات کے ساتھ

لیکچر: 1

ترجمہ حدیث

مولانا سیّد محمد ھارون زنگی پوری صاحب قبلہ

سائنسی تشریحات

محمد علی سیّد

کتاب: توحید مفضل

جلد: اوّل......لیکچر:1

ترجمہ حدیث: مولانا سید محمد ہارون زنگی پوری (مرحوم)

سائنسی تشریحات: محمد علی سیّد

تعداد اشاعت: ایک ہزار

سنِ اشاعت: ۲۰۱۲ء

سرورق: فضہ علی سیّد

زیر اہتمام: اسلام اینڈ سائنس ریسرچ فاؤنڈیشن۔ پاکستان
(زہرا اکیڈمی پاکستان کا ذیلی ادارہ)

کمپوزنگ سسٹم گرافکس

پرنٹر: شیری پرنٹنگ پریس

قیمت: ۳۰۰ روپے

ISBN: 978-969-9738-14-2

شرفِ انتساب

امام جعفر صادق علیہ السلام کے صحابی
شیخ مفضل ابن عمرؓ کے نام۔
جنہوں نے ان علوم کو اپنے آقا و مولا سے براہ راست حاصل کیا،
امام علیہ السلام کی موجودگی و نگرانی میں
اس کلام کو اپنی انگلیوں اور قلم کے ذریعے کاغذ پر منتقل کیا۔
اور اس دور میں جب لوگ پوچھتے ہیں کہ علم لدنی کیا ہوتا ہے؟
اللہ رب علیم و خبیر نے ایسے مواقع پیدا کر دیے کہ
علوم محمدؐ و آل محمدؐ کے ان گراں بہا بیش قیمت موتیوں کو
دنیا کے سامنے دوبارہ پیش کرنا آسان ہو گیا۔
جو زمانوں اور زبانوں کے بدلنے سے دنیا کی نظروں سے
اوجھل ہو گئے تھے۔
توحید مفضل کی یہ تین کتابیں، کل کا محض ایک جز اور علم لدنی
کی صرف ایک جھلک ہے
لیکن مشرق سے مغرب تک کے سائنس دانوں کو یہ سمجھانے
کے لیے کافی ہے،
کہ گزشتہ سارے زمانوں میں سائنس نے جو کچھ معلوم کیا،
صاحبانِ ذکر اور والیانِ اَمر نزول قران کے زمانے ہی میں
ان علوم کو بیان کر چکے تھے۔

محمد علی سید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

القرآن

"اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ بھی (ایک حیران کن نشانی) ہے کہ اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر یکایک تم آدمی بن کر چلنے پھرنے لگے"

(سورہ روم: آیت: ۲۰)

نہج البلاغہ

"یہ انسان بھی تعجب کے لائق ہے کہ ایک ہڈی سے سنتا ہے، گوشت کے ایک لوتھڑے سے بولتا ہے اور ایک سوراخ سے سانس لیتا ہے"۔

(حضرت علی ابن طالب علیہ السلام)

فہرست

محمد علی سیّد

چند گزارشات

کب سے الجھا ہوا ہوں کہ اس کتاب کا دیباچہ لکھ سکوں!
بات تفصیل سے کروں تو ممکن ہے آپ اکتا جائیں۔ مختصر بات کی جائے تو اپنی دلی کیفیت کا اظہار ممکن نہ ہو سکے گا۔

''توحید الائمہ'' نامی بیش قیمت کتاب میرے ہاتھ میں اس وقت آئی جب میں اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے سے بالکل قاصر تھا۔ یہ ایسا ہی تھا کہ کسی بچے کے ہاتھ میں ہیرے جواہرات دے دیے جائیں۔ بچہ ان جواہرات کی قدر و قیمت کا اندازہ کس طرح کر سکتا ہے!

لیکن 1974ء سے 2010ء تک پورے 36 سال یہ کتاب میرے دل و دماغ پر چھائی رہی۔ کبھی یہ کتاب میرے پاس رہی اور کبھی غائب ہو گئی...... البتہ ہیرے جواہرات کی چمک میری روح کو مسلسل اپنی طرف متوجہ کرتی رہی۔ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ میں اس کتاب کو کسی حد تک سمجھ سکوں گا اور اس کی سائنسی تشریح بھی لکھ سکوں گا۔

جب یہ کتاب مجھے ملی تو میں کچھ نہیں جانتا تھا سوائے اس کے کہ یہ کلام امامؑ ہے اور دل میں خیال آتا تھا کہ کاش کوئی عالم شخص علم کے اس خزانے کو آج کی عقل و فہم' آج کے اسلوب اور آج کی زبان میں منتقل کر سکے۔ علماء کے لیے یہ کام مشکل نہیں تھا لیکن مجھ جیسے جاہل نے اس کتاب کے صرف ایک حصے یعنی ''توحید مفضل'' کو کسی قدر سمجھنے میں 36 سال لگائے۔

جب میں نے ''توحید مفضل'' کی تشریح لکھنا شروع کی تو اس بچے کو ان ہیرے جواہرات کی قدر و قیمت کا کسی قدر احساس ہوا۔ اب معلوم ہوا کہ انھیں ہیرے جواہرات کہنا بھی مناسب نہیں۔ ہیرے جواہرات کی قدر و قیمت میں بھی اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔ کلامِ امامؑ کی عظمت کا

کوئی اندازہ ہی کب کر سکتا ہے کہ اس کی قیمت کا تعین کر سکے!

مارچ 2010ء کا زمانہ تھا۔ایک دن مجھے "توحید مفضل" کا خیال آیا۔شاید جناب مفضل ابن عمرؒ نے میرے کان میں سرگوشی کی ہو۔"کب تک ٹالتے رہو گے۔تمہیں وہ علم اور صلاحیتیں عطا کر دی گئی ہیں جن کے لیے تم دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے۔تمھیں معلوم ہی نہیں کہ دروازہ کب کا کھل چکا ہے......اس طرح نہ سوچو۔علماء کے اور بہت سے فرائض ہیں۔تم اپنا فرض نبھاؤ۔انھیں ان کا کام کرنے دو۔

پھر ایک دن اچانک ہی کسی نے میرا ہاتھ تھام کر میرے منتشر ذہن کو یکسو کر دیا اور میں لوکنگی وٹی کی حالت سے نکل آیا اسی لیے "توحید مفضل" کے تین لیکچرز کی تشریح محض چند ماہ میں مکمل ہو گئی۔ میں دعا یہی کر رہا تھا کہ بس اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ خدمت لے لے۔پھر اپنی معافی اور مغفرت کے ساتھ جب مناسب جانے مجھے اپنے پاس بلا لے۔(اگرچہ وہ دُور ہی کب تھا جو قریب کرے!)

میں آپ کو "توحید الائمہؑ اور" توحید مفضل" کا فرق بتانا تو بھول ہی گیا۔توحید الائمہ کتاب 1970ء میں پہلی بار رضویہ بک ڈپو کراچی سے شائع ہوئی۔پھر یہی کتاب جوں کی توں لکھنؤ کے ایک اشاعتی ادارے نے شائع کی۔2010ء میں اسی کتاب کو تازہ کمپوزنگ (اور نئی اغلاط) کے ساتھ اسلام آباد کے ایک کتب فروش نے شائع کیا۔2011ء میں اسی کتاب کو اسلام آباد ہی سے مرحوم مولانا ثقلین کاظمی صاحب نے بڑے اچھے گیٹ اَپ اور نئی کمپوزنگ کے ساتھ شائع کیا۔ بہر حال مختلف ادارے مولانا سید محمد ہارون زنگی پوری صاحب کا وہی ترجمہ شائع کرتے رہے ہیں جو غالباً 1970ء میں رضویہ بک ڈپو نے کراچی سے شائع کیا تھا۔کتب فروش حضرات اس کے سوا کر بھی کیا سکتے تھے! یہ کام تو دینی اداروں اور علما کا تھا کہ وہ اس پر کام کرتے اور اسلامی علوم کے اس خزانے کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کرتے کہ جس طرح اس کا حق تھا۔

اس کتاب کے مترجم معروف عالم دین مولانا سید محمد ہارون زنگی پوری صاحب ہیں۔مولانا نے یہ ترجمہ آج سے ستر اسی سال پہلے کیا تھا جب برصغیر میں عربی اور فارسی زبان مستعمل تھی۔یہ

ترجمہ حقیقت میں توحید پرستوں پر مولانا زنگی پوری صاحب کا ایک احسان تھا اور ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت فرمائے اور ان کے درجات کو بلند کرے۔

آپ جانتے ہیں زبانیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ عربی، فارسی کے الفاظ اب ہماری نئی نسل کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اب ہماری نئی نسل نجم آفندی کے نوحے، میرزا دبیر کے سوز وسلام اور میر انیس کے مرثیے بھی رومن اردو میں لکھ کر یاد کرتی ہے۔ ایسے میں مولانا زنگی پوری صاحب کا ترجمہ نئی نسل کس حد تک سمجھ سکتی ہے، اس کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔

توحید الائمہ کا ابتدائی حصہ "توحید مفضل" کہلاتا ہے۔ اس حصے میں اثبات وجود خدا کے حوالے سے امام جعفر صادق علیہ السلام کے چار لیکچرز ہیں۔

توحید مفضل کے تین لیکچرز جن کی سائنسی تشریح کی سعادت مجھے حاصل ہوئی ان میں بہت سارے علوم زیر بحث آئے ہیں۔ مثلاً علم الابدان (اناٹومی)، فعلیات (فزیالوجی)، طبیعات (فزکس)، کیمیا (کیمسٹری)، اسپیس سائنس (خلائی سائنس)، جیوگرافی، علم الحیوانات (زولوجی)، علم الاشجار (بوٹنی)، فلکیات (آسٹرونومی)، اور علم موسمیات...... ان میں سے بیشتر علوم وہ ہیں جن کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام کے عہد سے صدیوں پہلے اور آپ کے صدیوں بعد تک اس کرۂ ارض پر کسی عام انسان کو کچھ معلوم نہیں تھا سوائے اس کے جو اس کے مشاہدے میں آیا۔ یونان کے نامور فلسفی ارسطو نے بہرحال اناٹومی، آسٹرونومی، ایمبرولوجی، زولوجی، فزکس، اور زولوجی کے موضوع پر کتابیں اور رسائل تحریر کیے تھے اور وہی کچھ لکھا جو اس کے مشاہدے میں آیا لیکن اس نے بھی مخلوقات کو ان کے خالق کی نشانی کے طور پر نہیں دیکھا اور نہ خالق ومخلوق کے رشتے کو جاننے کی طرف توجہ مرکوز کی بہر حال ارسطو کے نظریات کے ایک بڑے حصے کو جدید سائنسی تحقیقات کے بعد سائنس دانوں نے حقائق سے بعید قرار دیا ہے۔

یونان کے علماء، فلکیات اور علم الابدان کے بارے میں بھی آج کی سائنس کے مقابلے میں

بہرحال بہت سرسری معلومات رکھتے تھے۔اس وقت تمام دارومدار نظریات پر تھا جن کی مشاہداتی تصدیق ایک ناممکن سی بات تھی۔

فلکیات کے باب میں یونان کے علمی معاشرے کے عام افراد کے اعتقادات کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔جہاں تک یونانی علماء کا معاملہ ہے تو یونانی علماء بھی ایک بے حرکت اور محدود کائنات کے قائل تھے۔انیسویں صدی کے نصف تک آئزک نیوٹن اور آئن اسٹائن جیسے نامور سائنس دان بھی اسی سحر میں گرفتار رہے۔حتیٰ کہ ایڈون ہبل نامی سائنس دان نے 1929ء میں جدید اور طاقتور ٹیلی اسکوپ کے ذریعے متحرک اور پھیلتی ہوئی کائنات کے حتمی اور مشاہداتی ثبوت دنیا کے سامنے پیش کیے اور ارسطو سے لے کر آئن اسٹائن تک کے بہت سے نظریات کو ماضی کے حوالے کر دیا۔

بات لمبی ہو جائے گی.....عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ان لیکچرز میں اُن موضوعات پر تفصیلی گفتگو فرمائی جن موضوعات کو آپؑ کے ایک ہزار سال بعد باقاعدہ سائنسی علوم کی حیثیت حاصل کرنا تھی۔ان بہت سارے علوم کے مطابق امام علیہ السلام کے کلام کی سائنسی تشریحات کرنا مجھ جیسے کم علم آدمی کے لیے کس قدر مشکل ہونا چاہیے تھا، شاید آپ اس کا اندازہ نہ کر سکیں۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مجھے اس میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔پاپولر سائنس کی کتابیں، ویب سائٹس، نیشنل جیوگرافکس، ڈسکوری اور اینیمل پلانٹ کی دستاویزی فلموں نے کلامِ امامؑ کو سمجھنے میں میری بہت مدد کی۔

ماحولیات، جنگلی حیات، میڈیکل سائنس اور اسپیس سائنس کے بارے میں جو کچھ ان فلموں میں دکھایا جاتا ہے وہ اِثبات وجودِ خدا کی ناقابلِ تردید، لازوال اور انمٹ نشانیاں ہیں۔ایسی عظیم الشان نشانیاں جنھیں نہ انسان قائم رکھ سکتا ہے اور نہ انھیں کبھی فنا کر سکتا ہے۔ان میں سے کسی ایک نشانی کو مٹانے کا مطلب خود فنا ہو جانے کے مترادف ہوگا۔مثلاً صرف چیونٹی کی کسی ایک ہی قسم کو مکمل طور پر ختم نہیں کیا جا سکتا اور اگر کر دیا جائے تو کرہ ارض کا پورا ماحول غیر متوازن ہو جائے گا۔

مغرب والے یہ بات جانتے ہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ کی ان نشانیوں کو بچانے کے لیے تحقیق

کرتے ہیں غو، رو فکر کرتے ہیں لاکھوں کھربوں ڈالر خرچ کرتے ہیں لیکن.....اللہ کا نام نہیں لیتے بلکہ ہر چیز کو نیچر سے منسوب کر دیتے ہیں۔یہ جانے بغیر (یا جاننے کے باوجود) کہ نیچر تو ایک نظام ہے جسے خالق کائنات نے اپنی مخلوقات میں جاری وساری کیا ہے۔

(اس موضوع پر امام علیہ السلام کی گفتگو آپ اس کتاب کے پانچویں باب میں ملاحظہ کریں گے)

کتاب ''توحید الائمہؑ'' کا ترجمہ جس سے میں نے استفادہ کیا، اس میں کئی مسائل تھے۔مثلاً فاضل مترجم نے کلامِ امامؑ کی وضاحت کے لیے بعض مقامات پر بریکٹ میں کچھ نوٹس تحریر فرمائے لیکن کتابت کرنے والے نے اکثر مقامات پر مترجم کی تحریر کے آغاز میں تو بریکٹ لگا دیا لیکن اس کے آخر میں لگانا بھول گیا یا اس کے برعکس شروع میں بریکٹ لگانے کے بجائے آخر میں بریکٹ لگا دیا۔

بظاہر یہ ایک معمولی سی غلطی معلوم ہوتی ہے لیکن، دراصل بہت بڑی غلطی ہے۔پڑھنے والا سمجھ نہیں پاتا کہ کہاں تک کلام مترجم ہے اور کہاں سے دوبارہ کلامِ امامؑ کا آغاز ہو رہا ہے۔اس مسئلے کو نظر انداز کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔اس لیے میں نے بار بار عربی داں دوستوں کو زحمت دی کہ وہ عربی متن کو پڑھ کر بتائیں کہ کلامِ امامؑ کہاں سے شروع ہو رہا ہے یا اس کے برعکس کہاں تک کلام مترجم ہے۔

تیسرے لیکچر کے تو آغاز ہی میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔اس لیکچر کا آغاز اردو میں اس طرح ہو رہا ہے کہ امام علیہ السلام نے فرمایا: ''دیکھو مفضل! اللہ تعالیٰ نے آسمان کو کیسا سبز رنگ کا بنایا!''

آپ بھی جانتے ہیں کہ آسمان دنیا کے کسی بھی حصے میں سبز رنگ کا نہیں ہوتا۔کلامِ امامؑ غلط نہیں ہو سکتا۔قلم رک گیا۔میں کئی دن تک اس مسئلے میں الجھا رہا۔اگر امام علیہ السلام نے آسمان کو سبز کہا ہے تو ہمیں اپنی اصلاح کرنا ہو گی اور آئندہ سبز کو نیلا اور نیلے رنگ کو سبز کہنا پڑے گا۔

ایک مہربان دوست نے نیٹ پر عربی متن کو دیکھا تو وہاں آسمان کے لیے ''اخضر'' ہی لکھا تھا۔اخضر کا مطلب ظاہراً سبز ہی ہے۔پھر انھوں نے ایک ویب سائٹ پر توحید مفضل کا عربی متن اور فارسی ترجمہ دیکھا۔وہاں عربی متن میں ''اخضر'' کو تبدیل کر کے ''ازرق'' یعنی نیلا لکھ کے مسئلہ

حل کر دیا گیا تھا۔

؎ جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔

میں نے اپنے محترم دوست سے درخواست کی کہ آپ کسی معتبر عربی لغت میں دیکھ کر بتایئے، ممکن ہے ''اخضر'' کے کچھ اور معنی بھی ہوں۔ قدیم اور معروف عربی لغت ''عروس اللغات'' دیکھی گئی تو مسئلہ حل ہو گیا۔

عربی میں آسمان کو اخضر اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے زمین پر ہریالی پیدا ہوتی ہے۔ اخضر اس رنگ کو بھی کہتے ہیں جو سیاہ اور سفید کے درمیان ہو۔ (صبح سویرے اور شام کے وقت آسمان کا رنگ سلیٹی ہی نظر آتا ہے۔)

اس کے علاوہ عربی لغت کے مطابق اخضر اس رنگ کو بھی کہا جاتا ہے جو نگاہوں کو اچھا لگے۔ نیلا آسمان آنکھوں کو کس قدر بھلا معلوم ہوتا ہے، آپ بھی جانتے ہوں گے۔ امام علیہ السلام نے اس لفظ کو ان تمام ہی معنی میں استعمال فرمایا ہے۔

یہ اعتراف کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ میں ''توحید مفضل'' کی مکمل تشریح کرنے میں ناکام رہا۔ آیندہ آنے والے صاحبانِ علم اس کلام کی مجھ سے کہیں بہتر تفسیر پیش کر سکیں گے۔ یہ کام دراصل ایسے شخص کے لیے تھا جو قدیم عربی اور جدید سائنس دونوں پر عبور رکھتا ہو۔ میں نے تو ایک سرسری سا کام کیا ہے۔ یہ اللہ کی قدرت ہے کہ سنگریزے بولنے لگیں، سوکھے ہوئے درخت برگ و بار پیدا کریں اور ان کی شاخیں پھولوں اور پھلوں سے بھر جائیں۔

مولانا شبیر حسن میثمی صاحب بڑی مہربان اور علم دوست شخصیت ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مستقبل پر نظر رکھتے ہیں۔ آنے والے زمانوں میں تبلیغ دین کی ضرورتوں سے بھی آگاہ رہتے ہیں۔ میں نے ان تینوں لیکچرز کی کمپوزنگ کے بعد انھیں آغا شبیر حسن میثمی صاحب کے سامنے رکھا۔ انھوں نے ان لیکچرز کی اشاعت کا فیصلہ کرنے میں چند سیکنڈ بھی ضائع نہیں کیے اور فرمایا: سید صاحب ان لیکچرز کی اشاعت کا فوری اہتمام کریں۔ ہمارا ادارہ

Presented by: Rana Jabir Abbas

ہر طرح سے آپ کے ساتھ ہے۔

قرآن اور سائنس ریسرچ فاؤنڈیشن پاکستان اور زہرا اکیڈمی پاکستان کی یہ کوشش آپ کے ہاتھ میں ہے۔توحید مفضل کو سائنسی تشریح کے ساتھ تین الگ الگ کتابوں کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ایک کتاب زیادہ ضخیم ہو جاتی۔اس کی قیمت بڑھ جاتی اور قارئین کا حلقہ محدود ہو جاتا۔ضخیم کتابیں لائبریریز کے لیے خریدی جاتی ہیں اور ان لائبریریز سے بہت کم لوگ استفادہ کرتے ہیں۔ میں نے کتابوں کے ایسے بہت سے قبرستان دیکھے ہیں جہاں اعلیٰ درجے کی الماریاں اور کتابیں دستیاب ہیں اور اس کے اردگرد رہنے والے کبھی کبھار ہی یہاں سورہ فاتحہ پڑھنے کو آتے ہیں۔البتہ ایسی لائبریریوں کے دوسرے فوائد بہرحال موجود ہیں۔

اس خدمت کے سرانجام دینے میں بہت سارے دوستوں نے کسی نہ کسی حد تک میری مدد کی ہے۔میں ان تمام دوستوں کا شکرگزار ہوں۔

توحید مفضل کی یہ تین جلدیں پریس میں جارہی ہیں تو اس موقع پر مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے مولانا ڈاکٹر کلبِ صادق صاحب میرے ساتھ ہی ہیں۔میں نے توحید مفضل پر کام آغاز کیا ہی تھا کہ محرم الحرام شروع ہو گیا۔مولانا ڈاکٹر کلبِ صادق صاحب کراچی تشریف لائے اور حسبِ معمول پہلی محرم ہی کو مجھے فون کیا۔

گزشتہ کئی برسوں سے ڈاکٹر صاحب کا یہ معمول رہا ہے کہ اس کم علم کو اسی طرح یاد فرماتے ہیں اور پھر سارے سال دنیا میں کہیں بھی ہوں،فون کر کے خیریت اور کام کی رفتار کے بارے میں معلوم کرتے رہتے ہیں۔مجھے کوئی مشکل ہو تو اسے دور کرنے میں دیر نہیں کرتے۔ڈاکٹر کلبِ صادق صاحب ایک مدت سے یہ کوشش کر رہے ہیں پاک و ہند کے تمام دینی مدارس کے لیے سائنسی موضوعات پر چھوٹی چھوٹی آسان زبان میں لکھی گئی کتابیں تیار کی جائیں۔

گزشتہ سال بھی موضوع گفتگو یہی رہا۔میں نے اسی دوران ''توحید مفضل'' پر جو کام کیا تھا، ان کی خدمت میں پیش کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے بے حد مصروفیت کے باوجود اسے تفصیل سے پڑھا۔ ان کی خوشی کو میں محسوس کر سکتا تھا۔ انہوں نے گلے لگا کر بہت دعائیں دیں اور میرے سر کے ایک بوجھ کو بھی کم کر دیا جس نے کئی ماہ سے میرے ذہن کو بوجھل کر رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائے، انہیں ہمیشہ خوش رکھے اور ان سے ہمیشہ خوش رہے۔

پروفیسر وقار احمد زبیری زولوجی کے سینئر اساتذہ میں سے ہیں اور دنیا کی کئی جامعات میں تدریس کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ توحید مفضل جلد: 2 پر آپ کا تبصرہ قابلِ مطالعہ اور میرے لیے انتہائی عزت افزائی کا سبب ہے۔ اس کے لیے میں پروفیسر وقار احمد زبیری کا بے حد شکر گزار ہوں۔

پروفیسر بدرالدجیٰ خان بھی فزکس کے سینئر اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں اور ایک طویل عرصے سے سائنس کے مختلف موضوعات پر مقالات لکھتے رہے ہیں۔ توحید مفضل جلد: 3 پر آپ نے جو تبصرہ فرمایا، اس کے لیے میں پروفیسر صاحب کا احسان مند ہوں۔

ڈاکٹر سید وقار یوسف عظیمی ایک علمی، روحانی خاندان کے فرد اور مہربان دوستوں میں سے ہیں۔ توحید مفضل جلد: 1 میں آپ کا تبصرہ شامل ہے۔ اپنی بے پناہ مصروفیات سے وقت نکال کر انہوں نے توحید مفضل پر جو تبصرہ فرمایا، وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر محمد رضا زیدی ادویات کی ایک بین الاقوامی کمپنی میں ریسرچ کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ میری اور ڈاکٹر رضا کی دوستی ممتاز کالج خیر پور کے زمانے کی ہے۔ توحید مفضل جلد: 1 پر ان کا تبصرہ میری ہمت افزائی کا سبب بنا۔ تھینک یو رضا۔

سید حسن امام رضوی نے میری تحریر کے حوالے سے جو تبصرہ کیا وہ توحید مفضل جلد: 2 میں آپ پڑھیں گے۔ ان کا اصرار تھا کہ کسی نے اپنے تبصرے میں تمہارا تذکرہ نہیں کیا اس لیے میں صرف تمہارے طرزِ تحریر پر لکھوں گا۔ حسن امام! بہت شکریہ۔

علامہ طالب جوہری صاحب سے نیاز مندی کا عرصہ کم و بیش چالیس سال پر محیط ہے۔ لکھنے

پڑھنے کا ذوق طالب جوہری صاحب کی صحبت ہی میں پروان چڑھا اور میں وہ پہلا آدمی ہوں جس نے علامہ صاحب کی تفسیر قرآن کو سب سے پہلے فیئر کرنے کا آغاز کیا۔ میں علامہ طالب جوہری صاحب کی گراں قدر رائے کے لیے ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔

جامعہ کراچی کے شعبۂ جغرافیہ کے سربراہ پروفیسر جمیل حسن کاظمی صاحب میرے محسنوں میں سے ہیں لیکن بڑی مشکل سے ہاتھ آتے ہیں۔ بہر حال اپنی مصروفیات سے انہوں نے وقت نکالا اور توحید مفضل:3 پر اپنے تبصرے سے سرفراز کیا۔ شکریہ پروفیسر جمیل حسن کاظمی صاحب۔

علامہ رضی جعفر نقوی صاحب، عالم و خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب قلم بھی ہیں۔ فی زمانہ یہ صفات کم ہی یکجا ہوتی ہیں۔ علامہ صاحب نے جس محبت کے ساتھ اس حقیر کی کوششوں کو سراہا اس کے لیے میں ان کا احسان مند ہوں۔

والسلام

جنس بازار معاصی

محمد علی سید

۱۵ اکتوبر ۲۰۱۱ء

توحید مفضل

حجت الاسلام والمسلمین

علامہ طالب جوہری صاحب قبلہ

اگر فلسفی اَسرار کائنات میں تجسس کرتے ہوئے برہان، یعنی خالص عقلی دلائل کے ذریعے کسی نتیجے تک پہنچ جائے تو اس کا یہ نتیجہ فلسفہ کہلاتا ہے۔ یعنی فلسفے کا یہ سفر زمین سے آسمان کی طرف صعودی سفر ہے۔ اس کے برعکس دین کا سفر ہبوطی ہے کہ وہ آسمان سے زمین کی طرف بقدر ضرورت، حقائق و معارف کی ترسیل کرتا ہے۔ چونکہ یہ ترسیل حقائق کی دنیا سے ہوتی ہے اس لیے اس میں شک وریب کی گنجائش نہیں ہوتی۔

زیرنظر کتاب امام جعفر صادق علیہ السلام کے اقوال کے ترجمے وتشریح پر مشتمل ہے۔ امام علیہ السلام کے ان اقوال کا شجرہ نسب بھی انہی آسمانی حقائق سے جڑا ہوا ہے جن کا سرچشمہ وحی والہام ہیں۔ میرے اس دعوے کی دلیل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ فرمان مبارک ہے جس میں صراحت کی گئی ہے کہ انی تارك فيكم الثقلين كتاب الله و عترتي۔ یہ حدیث مبارک حوالے سے اس لیے بے نیاز ہے کہ لاتعداد محدثین ورواۃ نے اس کی تخریج کی ہے۔

زیرنظر طویل حدیث عترت رسولؐ کے چھٹے امامؑ، امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے اور اس کے راوی حضرت مفضل بن عمر ہیں۔ مفضل بن عمر کا تذکرہ شیخ طوسی نے اپنے رجال میں امام جعفر صادق و امام موسیٰ کاظم علیہما السلام کے اصحاب میں کیا۔ استادِ معظم آیت اللہ العظمیٰ خوئی نے اپنے معجم الرجال میں تحریر کیا ہے کہ ان کی جلالت قدر کے لیے یہ کافی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے انھیں اس حدیث کے لیے مخصوص کیا جس کا نام "حدیث مفضل" ہے اور نجاشی نے

اس حدیث کو اپنے رجال میں ''کتاب فکر'' کے نام سے یاد کیا ہے۔
آیت اللہ العظمی مرحوم کے اس بیان سے راوی اور روایت دونوں کی وثاقت آشکار ہے۔
اس حدیث کا تذکرہ حدیث اور رجال کے قدیم مصادر میں اس کثرت سے ہے کہ اس کی وثاقت محتاج تعارف نہیں ہے۔

تین دہائیوں سے زیادہ عرصہ گزر گیا جب میں شمالی ناظم آباد میں سکونت پذیر تھا، ان دنوں محمد علی سید سے میری ملاقاتوں کا تواتر زیادہ اور دورانیہ طویل ہوا کرتا تھا۔ انہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو، میں نے ہی انہیں اس عظیم علمی سرمائے کی طرف متوجہ کیا تھا اور اس کے اردو ترجمے کی اطلاع بھی فراہم کی تھی۔ محمد علی سید اپنی نوجوانی سے ہی علم دوست اور ادب شناس ہیں۔ انہیں شعروشاعری اور تحریر تدوین سے ہمیشہ عملی دلچسپی رہی ہے۔ اس کا ثبوت ان کی وہ کتابیں ہیں جو آج قارئین کی دسترس میں ہیں اور بڑی حد تک چونکا دینے والی ہیں اور سب سے بڑھ کر ان کا یہ تحقیقی کام جو انہوں نے توحید مفضل پر سرانجام دیا ہے، انتہائی قابل قدر اور ستائش کے لائق ہے۔
موجودہ کتاب میں انہوں نے اپنی بے چین علمی طبعیت کا سکون تلاش کر لیا ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ انہی فکری وادیوں کو طے کرنے میں صرف کریں گے۔ میں نے اس کتاب پر اس لیے گفتگو نہیں کی کہ یہ کتاب خود اپنا تعارف ہے۔ البتہ قدیم ترجمے میں زبان اور اسلوب میں تبدیلیاں زمانے کے مطابق اور تشریحات برمحل، مدلل اور دل نشین ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس کتاب کو انگریزی زبان میں ترجمہ کر لیا جائے تو اسے بین الاقوامی سائنسی ادب کے مقابلے میں بڑے فخر سے رکھا جا سکتا ہے۔
میں دعا گو ہوں کہ ربّ العزت بہ طفیل معصومین علیہما السلام، محمد علی سید کو بیش از بیش توفیق عطا فرماتا رہے۔

طالب جوھری

یکم ذی قعد ۱۴۳۳ھ

توحید مفضل

ڈاکٹر وقار یوسف عظیمی

پی ایچ ڈی، کراچی یونیورسٹی

فرزند رسول، حضرت امام جعفر صادق سلام اللہ علیہ (پیدائش 80 ہجری، مدینہ منورہ۔ وصال 148 ہجری، مدینہ منورہ) علم و معرفت کا ایک ایسا سمندر ہیں جو سطح سے لے کر تہہ تک بے شمار خزانوں کا حامل ہے۔ یہ عظیم خزانے نہ صرف امتِ مسلمہ بلکہ پوری نوع انسانی کے لیے فیض اور کامیابیوں کا ذریعہ ہیں۔

اب اسے کوتاہ نظری اور ناشکری کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ کچھ لوگوں نے امتِ مسلمہ کی انتہائی عظیم المرتبت اور پوری نوع انسانی کے لیے فیض کا منبع، ان ہستیوں کو فقہ اور مسلک تک ہی محدود کر دیا ہے۔ ہمیں کوتاہ نظری سے دامن چھڑا کر وسیع النظری اور بصیرت کے ساتھ معرفت کی طرف قدم بڑھانا چاہیے۔

توحید مفضل، حضرت امام جعفر صادق سلام اللہ علیہ کے ان ارشادات کا مجموعہ ہے جو آپؑ نے اپنے ایک انتہائی لائق اور معتمد شاگرد جناب مفضل ابن عمرؓ کے سامنے بیان فرمائے۔ یہ مجموعہ عربی زبان میں ہے۔ ہمارے لیے باعث فخر اور حیران کن حقیقت یہ ہے کہ توحید مفضل نامی یہ جلیل القدر کتاب امام جعفر صادق سلام اللہ علیہ نے اس دور میں مفضل ابن عمرؓ کو لکھوائی جب سائنسی انداز سے سوچنے کا رواج تک نہیں تھا۔ لیکن اس کتاب میں امامؑ نے ان موضوعات پر گفتگو فرمائی جو آپؑ سے کم و بیش ہزار سال بعد سائنسی علوم کی بنیاد ثابت ہوئے۔ گویا سائنس کی دنیا میں بھی سبقت و فوقیت اولیائے خدا ہی کو حاصل تھی اور ہے۔

پاکستان کے معروف قلم کار جناب محمد علی سیّد کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق عطا فرمائی کہ آپ نے وقت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ''توحید مفضل'' کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس طرح حضرت امامؑ کے ارشادات اردو داں طبقے تک پہنچانے کا ایک اچھا اہتمام ہو گیا ہے۔ فاضل شارح نے اس کتاب میں متعلقہ موضوعات پر سائنسی تشریحات اور ان کے مستند حوالے بھی شامل کیے ہیں۔ ان تشریحات کی شمولیت سے آج کے تعلیم یافتہ خصوصاً نوجوان طبقے کے لیے ارشاداتِ عالیہ کو سمجھنا مزید آسان ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر ایم فِل یا پی ایچ ڈی کرنے والے ریسرچ اسکالرز اور دیگر محققین، مصنفین، دانشور حضرات اور اساتذہ کرام بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔

اس طالبِ علم کے رائے یہ ہے کہ ''توحید مفضل'' کے اس ترجمے اور سائنسی تشریح کو امت کے ہر حصے تک پہنچانے کی حتی الامکان سعی کی جانی چاہیے۔ اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی لائبریریز کے ساتھ ساتھ ہر مکتبہ فکر کے مدارس کی لائبریریز میں بھی اس کتاب کی موجودگی طلبا اور اساتذہ کے لیے بہت مفید ہوگی۔

دعا ہے کہ نبی آخر مدینۃ العلم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، باب العلم حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھرانے کے ایک عظیم رکن حضرت امام جعفر صادق سلام اللہ علیہ کے افکار کی ترویج و اشاعت کی اس کوشش پر اللہ تعالیٰ اپنے بندے محمد علی سیّد کو بہت اجر عطا فرمائے۔ فروغِ علم کی یہ کوشش ان کے لیے، ان کے بزرگوں کے لیے، ان کی اہلیہ اور اولاد کے لیے اور اس کام میں معاون افراد کے لیے صدقہ جاریہ بن جائے۔ آمین

اس کے ساتھ ہی میں یہ دعا بھی کرتا ہوں کہ امت مسلمہ اپنے عظیم اسلاف کے گراں قدر علمی ورثے کا حق سمجھنے اور اسے ادا کرنے کی فکر کی راہ پر گامزن ہو جائے۔ آمین

وقار یوسف عظیمی

توحید مفضل

ڈاکٹر سید محمد رضا زیدی

ریسرچ ڈائریکٹر برسٹل اینڈ مائراسکوپ۔ سنگاپور

توحید مفضل بلا شبہ ایک سائنسی کتاب ہے، جو اثبات وجود خدا کو سمجھانے کے لیے لکھی گئی۔ ہزاروں تقریریں اور سیکڑوں کتابوں کو پڑھ کر شاید ایک مسلمان صحیح معنوں میں صاحب ایمان یعنی مومن نہ بن پائے لیکن توحید مفضل پڑھنے کے بعد خدا کا انکار کرنے والوں کے لیے بھی ایمان لانا عقلاً واجب ہو جائے گا۔

میں خود کو ہرگز اس قابل نہیں سمجھتا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس کلام بلاغت پر کوئی تبصرہ کرنے کی جسارت کروں البتہ اس علمی خزانے کا ایک حصہ یعنی امام علیہ السلام کا پہلا لیکچر اینا ٹومی، فزیالوجی اور انسان کی زندگی کے بعض حیران کن پہلوؤں کا احاطہ متوجہ کرتا ہے۔ اس کے حوالے سے میں قارئین کو بعض حقائق کی طرف ضرور متوجہ کرنا چاہوں گا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سن ۸۳ھ صدی ھجری میں پیدا ہوئے اور ۱۴۸ صدی ھجری میں آپ دنیا سے تشریف لے گئے۔ دوسری صدی ھجری کا یہ زمانہ اسلامی دنیا میں علوم وفنون کے آغاز کا دور تھا۔ اس دور میں دوسری زبانوں سے مختلف علوم کی کتابیں، اسلامی دنیا میں لائی گئیں اور بعد کے ادوار میں ان کے تراجم عربی زبان میں ہوئے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ بنی امیہ اور بنو عباس کے درمیان اقتدار کی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ ایمرجنسی کے حالات میں حکمرانوں کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ اپنی سخت پالیسیوں اور جابرانہ احکامات کو ساری مملکت میں سختی سے برقرار رکھ سکیں۔ اسی لیے دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں آزادی اظہار اور آزادی خیال کا غلبہ زیادہ رہا اور اسی سبب

سے اس زمانے میں خود مسلمانوں میں بہت سے فرقے اور مکاتب فکر وجود میں آئے۔ اس وقت کسی شخص کو مسلمان معاشرے کا فرد ہوتے ہوئے بھی دین کے بنیادی عقائد پر اپنی رائے کا اظہار کرنے میں کوئی خوف نہیں تھا۔ ان عقائد میں سب سے بنیادی اور پہلا عقیدہ کائنات کے خالق کے وجود کو تسلیم کرنا ہے لیکن اس وقت اسلامی دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت و خالقیت کا کھل کر انکار کرتے تھے اور اکثر مسجد نبوی میں بیٹھ کر اسلامی عقائد کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

ایسی صورت میں خدا پرستوں کے سامنے دو ہی راستے تھے کہ یا ان دہریوں کو قتل کر دیا جائے اور یا عقل و علم کے ذریعے انہیں ہدایت کی راہ دکھائی جائے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اثبات وجود خدا کے دلائل کے ذیل میں امام علیہ السلام نے سب سے پہلے خود انسان کے وجود، اس کے جسم، اس کے اعضاء اور ان اعضاء کے درمیان ہم آہنگی کے ذریعے، اس انسان ، اس کے وجود اس کے اعضاء و جوارح اور جسم سے باہر کی دنیا میں موجود اشیاء اور جسم انسانی سے ان کی ہم آہنگی کو خالق کائنات کے وجود کی دلیل کے طور پر بیان کیا۔

اس ساری گفتگو کے دوران بیشتر سوال بھی امام علیہ السلام نے پیدا کیے اور ان کے جواب بھی آپ ہی نے جناب مفضل ابن عمر کو تعلیم فرمائے اور اس طرح دوسری صدی ہجری میں علم حیاتیات، علم تشریح الاعضاء اور علم فعلیات جیسے علوم پہلی پہلی بار پوری وضاحت اور صراحت کے ساتھ وجود میں آنا شروع ہو گئے۔

آپ سوچیں گے کہ ان علوم کے بارے میں تو یونان کے فلسفی بھی بہت کچھ جانتے تھے۔ یہ بات بہت حد تک درست ہے۔ لیکن علم حیاتیات کے بارے میں اگر ارسطو کے نظریات کو دیکھا جائے تو وہ آج خاصے مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً اس کا خیال تھا کہ چوہے گوبر سے پیدا ہوتے ہیں اور مکھیاں سڑے ہوئے گوشت سے۔

علم الابدان کے بارے میں جو کچھ مثلاً مثانے کے کھلنے اور بند ہونے والے پٹھوں کے

بارے میں جو انکشاف امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمائے، کیا ارسطو اور اس کے دو ہزار سال بعد آنے والے سائنس دان اس کے بارے میں کچھ جانتے تھے؟

کیا انسانوں کی مختلف شکلوں اور جانوروں کی یکساں صورتوں کے بارے میں یونان کے فلسفیوں سے لے کر انیسویں صدی عیسوی کے سائنس دان کچھ جانتے تھے؟

کیا انسانی بچے کے کم عقل وشعور کے ساتھ پیدا ہونے کی اسباب اور اس کی حکمتوں پر کوئی یونانی فلسفی اور مغرب کا سائنس دان بیسویں صدی عیسوی تک غور وفکر کر سکتا تھا؟

کیا کسی یونانی فلسفی، یا مغرب کے کسی ماہر طبیعات کو یہ بات معلوم تھی کہ آنکھ اور اشیاء اور کان اور آوازوں کے درمیان کچھ اور بھی چیزیں ہیں جن کے بغیر آنکھ اشیاء کا ادراک کرنے اور کان آوازیں سننے سے محروم رہتے!

میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس پہلے لیکچر سے اس طرح کی سیکڑوں مثالیں پیش کر سکتا ہوں لیکن اس کے لیے ایک پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ کتاب محمد علی سید نے لکھ دی ہے اور اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے۔

محمد علی سید میرے بچپن کے دوستوں میں سے ہیں۔ ہم ایک ساتھ پلے بڑھے۔ ممتاز کالج خیر پور میں بھی ہم نے ساتھ تعلیم حاصل کی اور آج تک ساتھ ہیں۔ کالج کے زمانے میں محمد علی سید کا زیادہ وقت شرارتوں میں گزرتا تھا۔ فرسٹ ایئر سائنس میں فیل ہو کر کراچی آئے اور بغیر کچھ پڑھے BA کر لیا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا...... انہوں نے سائنس کہاں پڑھی کہ آج سائنس کے انتہائی مشکل موضوعات پر ان کی کم از کم چار عام فہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ان کے مختلف ایڈیشن شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی ہر کتاب ایک عجوبہ ہے اور ہر کتاب پڑھنے والے کو اپنے خالق ومالک ہی کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ جو علمی تحریریں محمد علی سید کے قلم سے ظاہر ہوئی ہیں، اس معیار کی کتاب لکھنا سائنس کے بہت سے شعبوں کے ماہرین کے لیے بھی ممکن نہیں ہے۔ اس تیسرے لیکچر کی

سائنسی تشریح جس آسانی اور اسناد کے ساتھ محمد علی سید نے پیش کی ہے۔ میں یہ ساری زندگی یہ سب کچھ پڑھتا پڑھاتا رہا ہوں، لیکن میرے لیے ممکن نہیں کہ کلام امام کی اتنی آسانی کے ساتھ تشریح بیان کرسکوں۔

محمد علی سید تمہارے دماغ میں یقیناً کچھ خاص سیل (Cell) آن کردیے گئے ہیں جو غور وفکر نہ کرنے والے انسانوں کے دماغ میں عام طور پر خوابیدگی کی حالت میں رہتے ہیں۔

سید محمد رضا زیدی

سنگاپور

اس حدیث کے راوی

جناب مفضل ابن عمرؒ جُعفی

خدمات ومنزلت

یہ حدیث مبارک جوامام جعفرؑ کی زبان مبارک سے صادر ہوئی،توحید کے موضوع پرایک طولانی روایت ہے۔اس کے راوی مفضل ابن عمرؒ جعفی کوفی ہیں۔یہ حدیث اسی سبب سے توحید مفضل کے نام سے مشہور ہے۔اس حدیث کا فارسی،فرانسیسی،انگریزی اوراردو زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

"جناب مفضل ابن عمرؒ،امام جعفر صادقؑ کے نہایت ممتاز شاگرد ہیں۔جناب مفضل ابن عمرؒ کا تعلق جعفی قبیلے سے تھااورآپ کوفے کے رہنے والے تھے۔اسی لیے آپ مفضل ابن عمرؒ جعفی کوفی کے نام سے مشہور ہوئے۔آپ اپنے وقت کے نامور دانش منداور بہت ہی بافضیلت وباکمال شخصیت تھے۔

آپ نے امام جعفر صادق علیہ السلام اورامام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے مکتب علمی سے درس معرفت حاصل کیا۔بعض روایات کے مطابق انھوں نے امام محمد باقر علیہ السلام کی علمی محفل سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔جناب مفضلؒ،امام جعفر صادق علیہ السلام اورامام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے معتبر اورقابل بھروسا اصحاب میں شامل تھے۔دونوں اماموںؑ کے نزدیک انھیں خاص الخاص مقام حاصل تھا۔ (حوالہ: قاموس الرجال: جلد۹ صفحہ۹۳_۱۰۱)

مفضل ابن عمرؒ کی منزلت کو سمجھنے کے لیے یہ بات ہی کافی ہے کہ آپ امام جعفر صادقؑ اورامام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے اموال وصول کرنے اورخرچ کرنے میں دونوں اماموںؑ کے وکیل تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:"مفضل!جب تم دیکھو کہ ہمارے دوشیعوں کے درمیان مال پراختلاف ہواہے توہمارے مال سے رقم اداکرکے یہ جھگڑاختم کراسکتے ہو۔" (حوالہ:مفضل_امین امام)

مفضل ابن عمرؒ پہلی صدی ہجری کی آخری دہائی میں پیدا ہوئے۔آپ نے 80 سال کی عمر

پائی اور سن دو ہجری میں انتقال فرمایا۔ آپ کی جو تالیفات ہم تک پہنچی ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ توحید مفضل　۲۔ کتاب الوصیہ　۳۔ کتاب الیوم والیلۃ　۴۔ عِلَلُ الشرائع　۵۔ کتاب اہلیلج (یعنی ہڑ)۔ یہ کتاب "حدیث ہلیلہ" کے نام سے معروف ہے۔

جناب شیخ طوسیؒ نے اپنی "رجال" اور شیخ مفید علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب "ارشاد" میں جناب مفضل ابن عمرؒ کو امام جعفر صادقؑ کے عظیم اور مورد اطمینان اصحاب میں شمار کیا ہے۔

ہشام ابن احمد سے روایت ہے۔ "میں ایک دن امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرے ذہن میں خیال تھا کہ میں حضرتؑ سے مفضل ابن عمرؒ کے بارے میں سوال کروں گا لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: "خدا کی قسم مفضل ابن عمر جعفی ایک عظیم اور نیک انسان ہے۔" امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس جملے کو تیس سے زیادہ مرتبہ دہرایا اور پھر کہا۔ "اس کے گھر والے بھی ایسے ہی ہیں"۔

(حوالہ: البحار الانوار۔ جلد ۵۰ صفحہ ۳۴۰)

عبداللہ بن فضل ہاشمی روایت کرتے ہیں۔ "میں ایک مرتبہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا کہ مفضل ابن عمرؒ وہاں داخل ہوئے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کی نظر جیسے ہی ان پر پڑی تو آپؑ نے فرمایا: "مفضل! خدا کی قسم میں تمہیں دوست رکھتا ہوں اور تمہارے دوستوں کو بھی دوست رکھتا ہوں۔" اس کے بعد آپؑ نے فرمایا: "اگر میرے تمام اصحاب وہ معرفت رکھتے جو تم رکھتے ہو تو کبھی بھی دو افراد میں اختلاف نہ ہوتا۔"

مفضل ابن عمرؒ نے عاجزی سے عرض کیا: "فرزند رسولؐ! میرا خیال ہے آپؑ نے میرا مرتبہ زیادہ بلند کر دیا ہے۔"

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: "ایسا نہیں ہے۔ میں نے تو تمہیں وہی مقام دیا ہے جس مقام پر اللہ تعالیٰ نے تمہیں قرار دیا ہے۔" (حوالہ: البحار الانوار۔ جلد ۵۰ صفحہ ۳۹۵)

یہ تھا جناب مفضل ابن عمرؒ کی شخصیت کا ایک سرسری سا جائزہ۔ جو حضرات جناب مفضلؒ کی

شخصیت، خدمات اور ان کے مقام و منزلت کے بارے میں تفصیل جاننا چاہیں وہ درج ذیل ویب سائٹس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ 2-www.andishaqom.org 1-www.raban.ir

عجیب بات یہ ہے کہ علمِ رجال کے ماہرین کے ایک گروہ نے جناب مفضل ابن عمرؒ کی درخشاں شخصیت کو بہ وجوہ دھندلانے کی کوشش کی۔ جناب مفضلؒ کی شخصیت کو متنازعہ بنانے کے پیچھے وہی سوچ کارفرما رہی کہ راوی کو مشکوک بنا دیا جائے تو اس سے مروی علوم آل محمدؐ کے بارے میں شک وشبہ پیدا کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ لیکن اس کوشش میں خاک اڑانے والوں کے اپنے چہرے خاک آلود ہو گئے اور مفضل ابن عمرؒ کی شخصیت علومِ آل محمدؐ کے نور سے مزید جگمگا اٹھی۔

ہمارے اس دعوے کی دلیل وہ کلام ہے جو مفضل ابن عمرؒ نے امام علیہ السلام سے نقل کیا اور جسے آپ آئندہ صفحات پر ملاحظہ کریں گے۔

اب آپ سوال کر سکتے ہیں کہ جناب مفضل ابن عمرؒ کی شخصیت سے یہ معاندانہ رویہ کیوں روا رکھا گیا؟ اس کا سبب وہ روایتی، وراثتی مسلمان عابد و زاہد تھے جو ظاہری عبادات ہی کو مقصد زندگی سمجھتے تھے۔ ان کے مقابلے میں مفضل ابن عمرؒ جیسا توحید پرست تھا جو فرائض کی بجا آوری اور ظاہری عبادات سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ آثار کائنات میں غور و فکر بھی کرتا تھا۔

وہی غور و فکر جس کی دعوت قرآن مجید کی متعدد آیات میں موجود ہے۔" جو لوگ اٹھتے بیٹھتے، کروٹ لیتے (غرض ہر حال میں) اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی بناوٹ پر غور و فکر کرتے ہیں اور (بے ساختہ) کہتے ہیں کہ اے اللہ (بے شک) تو نے یہ سب کچھ بے سبب پیدا نہیں کیا۔ تو پاک و پاکیزہ ہے۔ سورہ آل عمران آیت:۱۹۱

احادیث کی کتابیں اس غور و فکر کی دعوت سے بھری ہوئی ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "ایک ساعت کا غور و فکر، ستر سال کی عبادت سے افضل ہے۔"

ایک اور مقام پر آپؐ نے ارشاد فرمایا: "جب ایک عابد جنت کے دروازے پر پہنچے گا تو فرشتے اسے خوش آمدید کہیں گے اور اسے جنت میں لے جایا جائے گا۔ لیکن جب ایک عالم جنت کے

دروازے پر پہنچے گا تو اسے روک لیا جائے گا۔ وہ سوال کرے گا کہ مجھے کیوں روکا گیا؟ تو فرشتے کہیں گے "آپ کو اس لیے روکا گیا ہے کہ آپ جتنے آدمیوں کی چاہیں شفاعت کریں اور انھیں اپنے ساتھ جنت میں لے جائیں۔" (حوالہ: نہج الفصاحت۔ تالیف: ابوالقاسم پاینده)

امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا: "نہ تو انھوں نے ان (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے انوارِ حکمت سے ضیاء حاصل کی اور نہ روشن علوم کے چقماق کو رگڑ کر نورانی شعلے پیدا کیے۔ یہ تو بس اس معاملے میں چوپائیوں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی بدتر" (حوالہ: نہج البلاغہ)

حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے فرمایا: "عبادت یہ نہیں ہے کہ کھڑے ہو کر (طویل) نماز پڑھی جائے یا (لمبے لمبے) سجدے کیے جائیں بلکہ عبادت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیقات پر فکر و تدبر کیا جائے"۔ (حوالہ: اصول کافی)

جناب مفضل ابن عمرؓ اسی غور و فکر کے عادی تھے۔ اسی لیے ان کے ذہن میں کب، کیوں، کیسے جیسے سوال پیدا ہوتے تھے۔ انھی سوالوں کے جواب حاصل کرنے کے لیے وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور اپنے علم و عمل اور دیگر خوبیوں کے ساتھ ساتھ خاص طور پر شاید انھی سوالوں کے سبب وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کو زیادہ عزیز تھے اور شاید اسی لیے اس زمانے کے بعض زاہد و عابد بزرگ اور ظاہربین افراد کے باطن میں مفضل ابن عمرؓ جیسے نوجوان کے لیے وہ کیفیت پیدا ہوئی جسے حسد سے قریب تر کہا جا سکتا ہے۔ شاید یہی سبب رہا ہو کہ مفضل ابن عمرؓ جیسے خدا پرست کے ساتھ ان کا رویہ بیشتر معاندانہ ہی رہا۔

ایسا کل بھی ہو رہا تھا، آج بھی ہو رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ لیکن مفضل ابن عمرؓ کل بھی علم حاصل کرنے اور اسے پھیلانے میں مصروف تھے، آج بھی کہیں نہ کہیں مصروف عمل ہیں اور آنے والے زمانوں میں بھی مصروف عمل رہیں گے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی گفتگو کا پس منظر

مفضل ابن عمرؓ کی زبانی

محمد بن سنانؒ روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے مفضل ابن عمرؓ نے بیان کیا:

''میں ایک روز نماز عصر کے بعد مسجد نبوی میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضے کے قریب قبرِ مبارک اور منبر کے درمیان بیٹھا تھا اور اس بات پر غور کر رہا تھا کہ پروردگارِ عالم نے ہمارے سیّد و سردار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو کیا کیا شرف اور فضائل عطا فرمائے، جنھیں امت کے تمام لوگ نہیں جانتے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی بعثت کے مقاصد سے لاعلم ہیں۔ زیادہ تر لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے فضل و کمال، منزلت و مراتب اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے بلند ترین مراتب سے آج بھی ناواقف ہیں۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک دھریہ جس کا نام ابن ابی العوجا تھا، مسجد نبوی میں داخل ہوا اور مجھ سے ذرا فاصلے پر آ کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر گزری تھی کہ اس کے ساتھیوں (اور ہم خیال لوگوں) میں سے ایک اور شخص مسجد نبوی میں داخل ہوا اور ابن ابی العوجا کے قریب ہی آ کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ گفتگو کا آغاز ابن ابی العوجا نے کیا اور قبرِ مطہر کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہنے لگا'' اس صاحب قبر نے بڑی عزت پائی۔ شرف و بزرگی کے تمام حصے اس نے حاصل کر لیے اور تمام حالات میں اس نے بڑا مرتبہ پایا۔''

اس کا ساتھی بولا۔'' ہاں وہ (محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم) ایک فلسفی آدمی تھا۔ اس نے بڑے مرتبے کا دعویٰ کیا اور اس دعوے پر وہ معجزے لایا جنھوں نے عام عقلوں کو حیران کر دیا۔ عقل مندوں نے انہیں سمجھنے کے لیے فکر کے دریاؤں میں غوطے لگائے مگر ناکام ہی رہے۔ پھر جب

عقلاء، فصحاء اور خطباء نے اس کی دعوت کو قبول کر لیا تو تمام لوگ فوج در فوج اس کے دین میں داخل ہونے لگے۔ جن جن شہروں تک اس کی دعوت پہنچی وہاں وہاں کے عبادت خانوں اور مسجدوں میں ناموس اکبر (یعنی خدائے تعالیٰ) کے نام کے ساتھ اس کا نام بھی شامل ہو گیا اور بلند آواز سے پکارا جانے لگا۔ اس میں خشکی کی تخصیص ہے نہ دریا کی، نہ پہاڑی ملکوں کی اور نہ ہموار ملکوں کی۔ یہ بلند آواز سے پکارا جانا بھی صرف ایک مرتبہ نہیں بلکہ ہر شب و روز میں پانچ پانچ مرتبہ۔ اذان و اقامت میں اپنا نام خدا کے نام کے ساتھ اس نے صرف اس لیے ملایا کہ ہر وقت اس کی یاد تازہ ہوتی رہے اور اس کے کام میں خلل اور کمزوری پیدا نہ ہو۔"

ابن ابی العوجا بولا: "محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذکر کو چھوڑو۔ اس کے معاملے میں تو میری بھی عقل حیران ہے اور میری فکر کو راستہ نہیں ملتا۔ اب اس پر سوچو کہ کس وجہ سے لوگ جوق در جوق محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین میں داخل ہو رہے ہیں؟ یعنی "پروردگار عالم" کے بارے میں بتاؤ کہ آخر وہ بھی کوئی چیز ہے کہ نہیں؟"

مفضل ابن عمرؒ بیان کرتے ہیں کہ اس کے بعد ابن ابی العوجا نے اشیائے عالم کی ابتداء پر بات کرنا شروع کی اور کہنے لگا کہ یہ سب چیزیں کس طرح بنیں۔ اس نے اس بات پر بھی خاص زور دیا کہ یہ سب چیزیں کسی نے نہیں بنائیں۔ ان کا کوئی بنانے والا اور مدبر و مصلح نہیں بلکہ یہ خود بہ خود پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ یہ دنیا اسی طرح چلتی آئی ہے اور اسی طرح چلتی رہے گی۔

مفضل ابن عمرؒ کہتے ہیں کہ ان (یعنی ابن ابی العوجا وغیرہ) کی یہ گستاخانہ گفتگو سن کر میں اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں نے ان کو ڈانٹا اور کہا۔ "اللہ کے دشمنو! اللہ کے دین کا انکار کرتے ہو؟ تم اس ذاتِ خالق کا انکار کرتے ہو جس نے تمھیں اس اچھی صورت پر پیدا کیا اور تمہارا بقیہ قرار دیا (یعنی تمہیں بہترین ساخت پر پیدا کیا) اور تمھیں ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل کرتا رہا (یعنی تم نہیں تھے اور پھر ہو گئے۔ پھر بچے سے جوان ہوئے) یہاں تک کہ تم اس حالت

میں پہنچے۔ اگر تم اپنے نفس (وجود) ہی پر غور کرتے اور تمہارا نفیس حاسّہ (یعنی عقل اور ذہن) تمہارے ساتھ صداقت برتتا تو اللہ کی ربوبیت کے آثار اور اس کی خلاّقیت و صنّاعیّت کے دلائل تمہیں اپنے نفس ہی میں موجود نظر آتے اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے وجود کے شواہد و براہین تم پر واضح ہو جاتے۔''

ابن ابی العوجا نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ ''مفضل! دیکھو اگر تم میں اس موضوع پر تفصیل سے بات کرنے کی صلاحیت ہے تو ہم سے بات کرو۔ اگر تمہارے پاس خدا کے ہونے کی کوئی مستحکم دلیل ہوئی تو ہم اسے ضرور مان لیں گے اور اگر تم اہلِ کلام میں سے نہیں ہو تو اس موضوع پر بولنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔

(جیسا کہ ہم جانتے ہیں) تم اگر جعفر صادق کے اصحاب میں سے ہو تو مفضل، ان کا طرز کلام تو ایسا نہیں ہے جیسی گفتگو تم نے کی ہے، ایسی گفتگو وہ نہیں کرتے اور نہ اس طرح کی دلیل پر ہم سے بحث کرتے ہیں۔ انھوں نے ہماری (اس طرح کی) باتیں اس سے بھی زیادہ سنی ہیں جو تم نے سنی ہیں لیکن نہ انھوں نے کبھی غصہ کیا اور نہ جواب دینے میں یہ لب و لہجہ اختیار کیا۔ وہ تو بہت ہی بردبار، باوقار، دانش منداور پختہ عقل کے انسان ہیں۔ نہ کبھی غصہ کرتے ہیں اور نہ سختی۔ وہ ہماری باتیں بڑی توجہ سے سنتے ہیں اور ہم سے ہمارے عقیدے کے حوالے سے مزید دلائل معلوم کرتے ہیں۔

یہاں تک کہ جب ہم اپنے دلائل مکمل کر لیتے ہیں اور ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ ہم نے انھیں لاجواب کر دیا تو عین اسی وقت وہ ہماری طویل دلیلوں کو اپنے ایک مختصر سے جملے اور ایک چھوٹی سی دلیل کے ذریعے باطل کر دیتے ہیں۔ ہم پر ان کی حجت قائم ہو جاتی ہے۔ وہ ہمارے عذر کو قطع کر دیتے ہیں۔ ہم ان کی مختصر سی دلیل کا جواب دینے سے بھی خود کو معذور اور بے بس پاتے ہیں۔ ہم ان کے جواب کو رد نہیں کر سکتے (اور ان کا منہ تکتے رہ جاتے ہیں)۔ تو مفضل اگر تم اُن کے اصحاب میں سے ہو تو اس طرح بات کرو'' (ورنہ اپنی راہ لو۔)

مفضل ابن عمرؒ بیان کرتے ہیں کہ ان کی باتیں سن کر میں مسجد نبوی سے بہت غم زدہ اور فکر

مند باہر نکلا کہ دین اسلام اور اہل اسلام اس فرقے (یعنی خدا کو نہ ماننے والوں) کی وجہ سے کیسی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ یہ (عجیب) لوگ ہیں کہ اللہ ہی کو نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ سب کچھ خود بہ خود ہی پیدا ہو گیا ہے۔

میں اسی حالت میں اپنے آقا صلواۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؑ نے مجھے اس شکستہ حال میں دیکھا تو فرمایا: ''کیا ہوا مفضل!'' (خیریت تو ہے)

مفضلؒ کہتے ہیں کہ میں نے ان دہریوں کی جو باتیں سنی تھیں اور جس جس دلیل سے ان کے کلام کو رد کیا تھا، وہ سب تفصیل آقا صلواۃ اللہ علیہ کے سامنے بیان کر دی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے میری باتیں سن کر مجھ سے فرمایا: (مفضل تم فکر نہ کرو)'' میں تمہیں باری تعالیٰ جلَّ عَزَّ اِسمُہٗ کی وہ حکمتیں بتاؤں گا جو تمام عالم اور درندوں، چوپائیوں، پرندوں، کیڑے مکوڑوں اور ہر قسم کے جانداروں خواہ وہ حیوان ہوں یا نباتات، پھل دار درختوں، عام پیڑ پودوں، غذا میں استعمال ہونے والی سبزیوں اور دوسرے نباتات میں موجود ہیں۔ میں تمہیں اثباتِ وجودِ خدا پر ایسے مستحکم دلائل کی تعلیم دوں گا اور ایسی باتیں بتاؤں گا جس سے عبرت حاصل کرنے والے سبق حاصل کر سکیں۔ ایمان والوں کے دلوں کو اطمینان قلب حاصل ہو اور اللہ کا انکار کرنے والے حیران و ششدر رہ جائیں۔ تم کل صبح سویرے میرے پاس آ جانا۔''

مفضل ابن عمرؒ بیان کرتے ہیں کہ یہ سن کر (میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا) میں نہایت خوش و خرم امام علیہ السلام کی خدمت سے واپس آیا (میرے لیے صبح کا انتظار کرنا مشکل ہو رہا تھا) مجھے وہ رات بہت طولانی محسوس ہوئی۔ رات بھر بے تاب رہا کہ صبح ہو اور میں وہ دلائل و معلومات امام علیہ السلام سے حاصل کروں، جن کا حضرتؑ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے۔

صبح ہوئی تو میں درِ دولت پر حاضر ہوا۔ باریابی کی اجازت ملنے کے بعد میں زیارت سے مشرف ہوا اور باادب کھڑا رہا۔ آپؑ نے مجھے بیٹھ جانے کا حکم دیا تو میں مؤدب ہو کر بیٹھ گیا۔

پھر امام جعفر صادق علیہ السلام اپنی جگہ سے اٹھے اور اس کمرے کی طرف بڑھے جہاں اکثر

تخلیہ فرمایا کرتے تھے۔ میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ آپؑ نے فرمایا: ''آ جاؤ......'' میں آپ کے پیچھے پیچھے چلا۔ آپ اس مخصوص کمرے میں داخل ہوئے اور وہاں تشریف فرما ہوئے اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ فرمایا۔ میں دو زانو ہو کر آپؑ کے سامنے بیٹھ گیا۔ آپؑ نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور فرمایا: ''گویا میں دیکھ رہا ہوں انتظار کے سبب گزشتہ رات تمہیں بہت طولانی معلوم ہوئی!''

میں نے عرض کی۔ ''جی آقا ایسا ہی ہے۔''

☆☆☆

کلام الامام، امام الکلام

پہلے دن امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے اس معجز نما کلام کا آغاز فرمایا جسے قارئین اس کتاب کے آئندہ صفحات پر ملاحظہ فرمائیں گے۔

واضح رہے کہ مفضل ابن عمرؓ، امام جعفر صادق علیہ السلام کی اجازت سے مسلسل چار دن تک امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور اُس علم لدنی سے فیض یاب ہوتے رہے جس کے سامنے دنیا والوں کا علم اور دلائل راکھ کے ایک ذرّے سے بھی زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

ان تین علمی نشستوں میں سے پہلی نشست میں امام علیہ السلام نے جو کچھ فرمایا، وہ اس کتاب میں شامل ہے۔ یہ کتاب امام جعفر صادق علیہ السلام کے پہلے لیکچر اور اس کی سائنسی تشریح پر مشتمل ہے۔ باقی دو لیکچرز جو بالترتیب علم الحیوانات اور زمین و آسمان میں موجود اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے متعلق ہیں قرآن اینڈ سائنس ریسرچ فاؤنڈیشن پاکستان کے زیر اہتمام دو الگ کتابوں کی شکل میں اس جلد کے ساتھ ہی شائع کیے جا رہے ہیں۔

واضح رہے کہ ان لیکچرز میں جن علوم کا تذکرہ اور ان کی وضاحت پیش کی گئی اس کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے صدیوں پہلے اور صدیوں بعد بھی اس کرہ ارض پر کسی علمی معاشرے، کسی فلسفی، کسی حکیم اور کسی ماہر حیاتیات کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

مقامِ شکر میں اعضاء کا تذکرہ

پروردگار! میں اپنے ایمان کی حقیقت ،اپنے یقینِ محکم، خالص اور واضح توحید، ضمیر کے پوشیدہ اَسرار، نورِ بصارت کی گزرگاہوں، صفحہ پیشانی کے خطوط، سانس کے گزرنے کے شگاف، قوتِ شامہ کے خزانوں، قوتِ سماعت تک آواز پہنچنے کے سوراخوں، ہونٹوں کے اندر دبے ہوئے رموز، زبان کی حرکت سے نکلے ہوئے الفاظ، منہ کے اوپر اور نیچے کے جبڑوں کے ارتباط کی جگہوں، داڑھ کے اُگنے کے مقامات، کھانے پینے کی سہولت کے راستے، کاسہ سر کو سنبھالنے والے استخوان، گردن کے اعصاب کے ارتباط کی سہولتوں، سینے کی فضاؤں، گردن کے رشتوں کو سنبھالنے والے اعصاب، قلب کے پردے کو روکنے والے ڈورے، جگر کے ٹکڑوں کو جمع کرنے والے اجزاء، پہلو، جوڑ بند، قوائے عمل، اطرافِ انگشت کے محتویات و مشتملات، گوشت، خون، بال کھال، اعصاب، شریانوں، استخوان، مغز، رگوں، جوارح اور دورانِ رضاعت و شیرخواری مرتب ہونے والے اجزاء، بدن اور زمین نے جو میرے وجود کا بار اٹھا رکھا ہے اور نیند و بیداری، حرکات و سکنات، رکوع و سجود...... سب کے حوالے سے اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اگر میں ارادہ بھی کروں اور کوشش بھی کروں کہ آخرِ زمانہ تک زندہ رہ کر تیری کسی ایک نعمت کا شکریہ ادا کر سکوں تو یہ ناممکن ہے مگر یہ کہ تیرا احسان بھی شامل حال ہو جائے، مگر وہ خود بھی تو ایک مزید شکریے کا طلب گار ہے!

از: امام حسین علیہ السلام

اقتباس: دعائے عرفہ ۵۸ ہجری

باب: 1

ہم اللہ کی حمد بیان کرتے ہیں

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"دیکھو مفضل! اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے موجود تھا۔ اس سے پہلے کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کی ذات ہمیشہ باقی رہے گی۔ اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ہم اس کی حمد بیان کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں (حقائق کا) الہام کیا اور ہم اسی کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں (کائنات کے) اعلیٰ علوم عطا فرمائے اور بلند مراتب کے ساتھ ہمیں اپنی مخلوق پر فضیلت عطا کی اور اپنی حکمتیں دے کر ہمیں ان پر امین مقرر کیا۔"

امامؑ گفتگو فرما رہے تھے اور مفضلؒ بن عمر امامؑ کی گفتگو کو قلم بند کرتے جا رہے تھے۔

محدود عقل

ان ابتدائی کلمات کے بعد امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

"جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کائنات کا کوئی پیدا کرنے والا نہیں ہے اور یہ سب کچھ جو زمین اور آسمان میں ہے خود بہ خود پیدا ہو گیا ہے تو دراصل یہ ان کی محدود عقل کا قصور ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

یہ لوگ اپنی کم علمی وکم عقلی کی وجہ سے مخلوقات کی پیدائش میں اور ایک مخلوق سے دوسری مخلوق کے درمیان موجود رشتے کو سمجھنے سے معذور ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی اس حکمت اور صنعت (ٹیکنالوجی) کو بھی نہیں سمجھ پاتے جو اللہ تعالیٰ نے صحراؤں، میدانوں، سبزہ زاروں، سمندروں، دریاؤں اور پہاڑوں، ہموار اور ناہموار زمینوں میں پیدا ہونے والی طرح طرح کی مخلوقات، انسانوں، حیوانوں، پیڑ پودوں، ننھے ننھے کیڑوں، معدنیات، جڑی بوٹیوں، ہواؤں، فضاؤں، بارشوں، سورج کے طلوع وغروب ہونے، چاند اور ستاروں کے حرکت کرنے میں (صَرف کر) رکھی ہیں۔

ان کی عظمت، اہمیت اور قدر و قیمت کو توفیق الٰہی حاصل ہونے کی صورت میں صرف صاحبانِ عقل وعلم ہی سمجھ سکتے ہیں۔ کفار جنہیں قرآن میں جانوروں سے بھی بدتر کہا گیا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں، اسی طرح جس طرح جانور صرف آج میں زندہ رہتا ہے۔ اسے اپنے کھانے پینے، افزائشِ نسل کرنے اور بھاگنے دوڑنے کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا۔

یہ جانور بھی اللہ ہی کے بنائے ہوئے نظام کے مطابق ذمہ داریاں پوری کرتے ہیں لیکن وہ مکلّف نہیں کہ اللہ کی نشانیوں اور

اس کی خلقت کے نظام پر غور کریں (اور نہ انھیں اس کی عقل دی گئی ہے)۔

اللہ کا انکار کرنے والوں کی مثال ان جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ اللہ نے انہیں آنکھیں دی ہیں مگر دیکھتے نہیں، کان دیے ہیں مگر سنتے نہیں، عقل وشعور عطا کیا ہے لیکن یہ اس عقل وشعور سے بس اتنا ہی کام لیتے ہیں جس قدر جانور اپنی محدود عقل سے لے سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام باتوں سے برتر ہے جسے یہ بیان کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ انہیں قتل کرے یہ کہاں بہکے چلے جا رہے ہیں!

نابینا افراد کی مثال

"دراصل معاملہ یہ ہے کہ ان لوگوں کی مثال ان نابینا افراد کی سی ہے جو کسی انتہائی خوب صورت، کشادہ، تمام آسائشوں سے مزین گھر میں داخل ہو گئے ہوں۔ اس گھر میں قالین بچھے ہیں، چھتوں پر فانوس لٹک رہے ہیں، کمروں میں بہترین اور خوب صورت ساز وسامان موجود ہے۔ مختلف مقامات پر شمعیں روشن ہیں۔ ایک وسیع دسترخوان پر طرح طرح کے تازہ اور مزے دار کھانے سجے ہوئے ہیں۔ گھر میں ہر موقع کی مناسبت سے پہنے جانے والے ملبوسات بھی موجود ہیں۔ غرض اس عالی شان گھر میں ضرورت کی ہر چیز وافر مقدار میں اپنی اپنی جگہ رکھی ہے"۔

نابینا افراد کا ہاتھ تھامنے والا کوئی نہ ہو؟

جب یہ نابینا افراد، اس گھر میں داخل ہوں اور کوئی ان کا ہاتھ تھامنے والا' انہیں راستہ بتانے والا' انہیں ان کی جگہ پر بٹھانے والا وہاں موجود نہ ہو تو وہ نابینا افراد کبھی ایک چیز سے ٹکرائیں گے کبھی دوسری چیز سے ٹھوکر کھائیں گے۔ کبھی کچھ توڑیں گے، کبھی خود زخمی ہوں گے۔ یہ بس دائیں بائیں ہاتھ چلاتے رہیں گے اور سمجھ ہی نہیں پائیں گے کہ کس چیز کی کیا اہمیت ہے' اسے یہاں کیوں رکھا گیا ہے' یہ کس طرح بنی ہے' کس کام آتی ہے' کس طرح استعمال کی جاتی ہے' اس چیز کے یہاں رکھے جانے کے کیا فائدے ہیں۔ وہ نابینا افراد ان چیزوں سے ٹکراتے رہیں گے' جھنجلاتے رہیں گے' غصہ کرتے رہیں گے' ان چیزوں کے بنانے والے یا انہیں اس مقام پر رکھنے والے کو برا بھلا کہتے رہیں گے۔

بس یہی حال ان لوگوں کا ہے جو اللہ تعالیٰ کی خلاقیت' اس کی وحدانیت اور ربوبیت کا انکار کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کا ذہن (ان کی اپنی ضد کی وجہ سے) اس دنیا میں موجود اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے اسباب اور ان کی اہمیت وافادیت کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ یہ لوگ اپنے جہل کے سبب ان اشیاء کی خوبیوں اور ضرورت کو نہیں سمجھ پاتے۔''

نوٹ: پانچ سو سال پہلے کا انسان

اس مثال کو اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ مثلاً آج سے پانچ سو سال پہلے کے انسان کو زندہ کر کے آج کے کسی جدید گھر میں رہنے کے لیے کہا جائے تو وہ کیا کرے گا؟ وہ آج کی حیران کن سہولتوں مثلاً لوہے کی سواریوں (گاڑیوں)' دیوار میں سے آتی آوازوں اور تصویروں (ٹی وی)' دیوار میں سے نکلتے ہوئے کرنسی نوٹوں (ATM مشین)' ہاتھ کو کانوں پر رکھے ہوئے تنہائی میں باتیں کرتے ہوئے لوگوں' ہوائی جہازوں' ٹریفک کے ہجوم' گھروں کے اندر انگلی کے اشارے سے آن آف ہوتے ہوئے ٹی وی اور اے سی سے ٹھنڈی ہوا نکلتے دیکھ کر اس پر کیا گزرے گی؟ وہ اپنی کم علمی اور محدود سوچ کے سبب کسی چیز کی اہمیت کو سمجھ ہی نہیں پائے گا' انہیں استعمال نہیں کر پائے گا اور جھنجلاہٹ کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ ممکن ہے وہ ان تمام جدید سہولتوں اور ان کے ایجاد کرنے والوں کو نار وا کلمات سے نوازے۔

اسی طرح اس عظیم کائنات' اس دنیا اور خود ہمارے وجود میں اللہ تعالیٰ کی خلاّقیت کی جو عظیم نشانیاں موجود ہیں وہ کم عقل یا ضد پر آمادہ شخص کے لیے ناقابل یقین اور جھنجلاہٹ کا سبب ہیں۔

اگر آج کسی عام آدمی کو جو موبائیل فون کا استعمال نہیں جانتا' اس کا کوئی مہربان ٹچ سسٹم والا ایک بہترین موبائیل فون تحفے میں دے دے تو اگر اس میں موبائیل فون استعمال کرنے یا سیکھنے کی صلاحیت نہ ہو تو وہ بہت جلد اس سے چڑ جائے گا۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکے گا کہ اس کے دوست نے اسے کس قدر فائدہ مند چیز تحفے میں دی ہے۔ اپنی جھنجلاہٹ میں وہ اس سے فائدہ ہی نہیں اٹھا سکے گا بلکہ اسے اپنے لیے ایک مصیبت سمجھنے لگے گا۔

بہت شکر ادا کرنا چاہیے

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

''کم عقل' ضدی اور جاہل لوگوں کے برعکس جو حقائق کو سمجھتے

نہیں ہیں یا سمجھنا ہی نہیں چاہتے..... جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کی معرفت عطا کی ہو' اسے اپنے دین کی طرف ہدایت دی ہو اور دنیا میں موجود مخلوقات کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی مصلحت پر غور کرنے اور جن منصوبوں کے تحت یہ چیزیں بہترین طریقے پر پیدا کی گئی ہیں، اسے سمجھنے کی توفیق دی ہو تو ایسے شخص پر لازم ہے کہ وہ اس پر اللہ رب العالمین کی بہت حمد کرے' بہت شکر ادا کرے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ اللہ نے اسے جو عقل و شعور عطا کیا ہے اور جو معرفت دی ہے اور قوت بیان کی جس صلاحیت سے اللہ نے اسے سرفراز کیا ہے' اللہ رحمان و رحیم اسے اس کے لیے قائم رکھے اور اس میں اضافہ فرمائے کیوں کہ وہ فرماتا ہے "اگر تم میرا شکر ادا کرو گے تو تمہیں اور زیادہ دوں گا اور اگر میری نعمتوں کا انکار کرو گے تو جان لو کہ میرا عذاب بہت سخت ہے"۔

کائنات کے اجزاء

"مفضل! دیکھو اللہ تعالیٰ کے وجود پر پہلی دلیل تو یہ کائنات ہے، جو ہمارے ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ ذرا غور تو کرو کہ اس کے اجزاء کس طرح ترتیب دیے گئے ہیں؟ یہ اجزاء ہیں کیا' کہاں سے آئے؟ اگر تم اس کائنات (یعنی سورج' چاند' ستاروں' کہکشاؤں' پھر ان سب کی ایک نپے تلے انداز میں حرکت) پر غور کرو اور ہر

ایک چیز کو الگ الگ کر کے سمجھنے کی کوشش کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ یہ سب کچھ کسی اعلیٰ ترین ذات نے پیدا کیا ہے" (اور طے شدہ منصوبے کے تحت ایک خاص مدت تک کے لیے پیدا کیا ہے)

نوٹ: کائنات کے اجزاء کیا ہیں؟

امام جعفر صادق علیہ السلام کے درج بالا کلمات کی تشریح کے لیے بہت سی کتابیں بھی لکھی جائیں تو اس کلام کی تشریح کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کلام کی مختصر وضاحت اس سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ بہر حال ہم اس سلسلے میں معروف مصنف محمد عبداللہ صاحب کی ایک بہت مستند کتاب "کائنات" سے استفادہ کر رہے ہیں۔ اس سائنسی عبارت کو پڑھنے میں ممکن ہے بعض افراد کو دشواری محسوس ہو لیکن اگر اسے آپ نے پڑھ لیا تو آپ تخلیق کائنات کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس معجز نما کلام کی قدر و قیمت کا کسی حد تک اندازہ کر سکیں گے۔

"کائنات مادے، توانائی اور خلا پر مشتمل ہے۔ ہمارے اطراف میں موجود مادہ مختلف عناصر (elements) یا ان کے کیمیائی مرکبات پر مشتمل ہوتا ہے۔ عنصر مادے کا بنیادی ذرہ ہوتا ہے جس کی ساخت کو کسی کیمیائی ترکیب سے تبدیل نہ کیا جا سکے۔ مثلاً ہائیڈروجن، آکسیجن، کاربن، فولاد، سونا، یورینیم وغیرہ۔

زمین پر پائے جانے والے عناصر کی مجموعی تعداد تقریباً ۱۰۰ ہے۔ عناصر ایٹموں پر مشتمل ہوتے ہیں جبکہ اشیاء ایک یا زیادہ عناصر کے ایٹموں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ہوا، پانی، انسان، کاغذ، قلم، لکڑی، پتھر سب کئی مختلف عناصر کے ایٹموں سے بنے ہوتے ہیں۔ مثلاً ہوا...... نائٹروجن، آکسیجن اور ہائیڈروجن وغیرہ کے ایٹموں کی کیمیاوی آمیزش سے تخلیق پاتی ہے جبکہ انسانی جسم ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن، کاربن، کیلشیئم اور فولاد وغیرہ کے ایٹموں پر مشتمل ہوتا ہے۔

ایک ایٹم اپنے مرکز (nucleus) اور الیکٹران پر مشتمل ہوتا ہے جس میں الیکٹرون مرکز

کے گرد گردش کرتا رہتا ہے جبکہ مرکز پروٹون اور نیوٹرون پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک ایٹم کا ذرہ اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ کسی بھی خوردبین سے اس کا مشاہدہ ممکن نہیں ہوتا۔

بیسویں صدی کے نصف تک ایٹم کو دیکھنا ممکن نہیں تھا لیکن اب پارٹیکل ایکسی لیٹر (Particle Accelerators) سے ایٹم کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ ہائیڈروجن کے ایٹم کا قطر (diameter) ایک ملی میٹر کے لاکھویں حصے کے مساوی ہوتا ہے جبکہ اس کے مرکز کا قطر پورے ایٹم کے قطر کے دس ہزارویں حصے کے مساوی ہوتا ہے۔

پروٹون اور نیوٹرون کے مقابلے میں الیکٹرون میں مادّے کی بہت کم مقدار ہوتی ہے۔ ایک ایٹم کا 99.98 فیصد مادّہ اس کے مرکز میں ہوتا ہے۔ نیوٹرون میں پروٹون کے مقابلے میں تقریباً 0.10 فیصد زیادہ مادّہ ہوتا ہے۔

اگرچہ تمام نیوٹرون، پروٹون اور الیکٹرون ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں لیکن تمام مراکز (Nucleus) ایک جیسے نہیں ہوتے۔ کسی مرکز میں پروٹونوں کی تعداد سے یہ طے ہوتا ہے کہ یہ کس عنصر کا مرکز ہے۔ مثلاً صرف ایک پروٹون پر مشتمل مرکز ہائیڈروجن کا ہوتا ہے، 8 پروٹون کے حامل ایک مرکز سے آکسیجن کے ایٹم تشکیل پاتے ہیں جبکہ 26 پروٹون سے فولاد کے مرکز کی تخلیق ہوتی ہے، سونے کا ایٹم 79 پروٹونز کا حامل ہوتا ہے اور یورینیم کے مرکز میں پروٹونز کی تعداد کی نشاندہی اس کے ایٹمی نمبر سے ہوتی ہے لہٰذا معیاری آکسیجن کا ایٹمی نمبر 8 اور یورینیم کا 92 ہوتا ہے۔

سب کی اصل ایک ہے

کائنات میں موجود تمام اشیاء اور جانداروں کی تخلیق ایک ہی بنیادی مادّے یا ان کے مرکبات سے ہوئی ہے۔ جاندار بظاہر گوشت پوست کی ساخت رکھتے ہیں لیکن ان کے اجزاء بھی ایسے ہی مادّے پر مشتمل ہوتے ہیں جن سے ستاروں اور سیاروں کی تخلیق ہوئی ہے۔ ستاروں کی تخلیق کا خام مال گیسز اور معدنیات ہوتی ہیں اسی طرح زمین اس پر موجود پودوں، انسانوں اور حیوانوں کی تخلیق کا خام مال بھی یہی ہے، اگرچہ ان کے تناسب میں فرق ہوتا ہے۔ ہم انسانوں کا

جسم تقریباً 63 فیصد ہائیڈروجن' 25 فیصد آکسیجن اور 10 فیصد کاربن پر مشتمل ہوتا ہے جبکہ بقیہ 2 فیصد مادے میں نائٹروجن' پوٹاشیم' کیلشیم اور دوسرے عناصر ہوتے ہیں۔

سائنس دانوں کے مطابق خالق کائنات نے زمین پر زندگی کی تخلیق ایک طویل مرحلہ وار ارتقائی عمل کے ذریعے کی۔اس کے پہلے مرحلے میں گیسوں پر توانائیوں کے ردّعمل میں امائنو تیزاب(amino acid) وجود میں آئے اور پھر ان سے لحمیات(proteins) پر مشتمل زندگی کے حامل سالموں کی تخلیق ہوئی۔اس ایک خلیے سے اسی قسم کے اور خلیے اور پھر ان سے دو اور اس سے زیادہ خلیوں پر مشتمل زندگی پیدا ہوتی گئی۔کروڑوں سال کے ارتقا کے نتیجے میں اور مختلف اقسام کے جانداروں کے ملاپ سے مخلوقات کی نئی اقسام وجود میں آتی رہیں۔زمین کے زیادہ بڑے جاندار بعد کے دور کی پیداوار ہیں۔اگرچہ انسانوں سے مشابہ جانداروں (hominids) کا وجود کروڑوں سال قدیم ہے لیکن موجودہ شکل وصورت کا انسان یہاں کی جدید ترین مخلوقات میں سے ہے۔ہم مکمل انسانوں کی نسل(homo sapiens) ایک لاکھ سال سے زیادہ قدیم نہیں۔

(حوالہ: کائنات۔ مصنف: محمد عبداللہ)

زمین پر ضرورت کی ہر شئے موجود ہے

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"مفضل! تم اس زمین ہی کی نسبت سے دیکھو اور غور کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ کرۂ ارض ایک ایسے مکان کی مانند ہے جس میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں جن کی بندوں (یا یہاں کی دوسری مخلوقات) کو ضرورت ہو سکتی ہے۔مثلاً زمین (گول ہونے کے باوجود) کسی فرش کی طرح بچھی ہوئی ہے۔آسمان کسی چھت کی مانند ہے اور اس آسمان میں سورج چاند اور ستارے اس طرح

موجود رہتے ہیں جیسے مکان میں بہت سے چراغ رکھے ہوں اور اپنے اپنے موقع اور مناسبت سے روشن ہوتے رہتے ہوں۔

معدنیات اور جواہرات زمین کے اندر اس طرح پوشیدہ ہیں جیسے مکان میں خزانے اور مختلف چیزوں کے ذخیرے ہوتے ہیں۔ ان سب کے علاوہ ضرورت کی ہر شئے (مثلاً روشنی، ہوا، پانی، اناج، سبزیاں، گوشت، دودھ اور لباس فراہم کرنے والے چوپائے) اپنی اپنی ضرورت کے مطابق یہاں موجود ہے۔

اور انسان..... انسان اس دنیا میں ایسا ہے جیسے اس مکان کا مالک اور آقا جس کے قبضے میں اس مکان میں موجود تمام چیزیں ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز حیوانات کی غذا ہے، کوئی انسان کے لیے دوا، کوئی چیز زینت و آرائش کے لیے ہے۔ کوئی جانوروں کی دوا، کوئی انسانوں کی غذا، کوئی چیز صرف پرندوں کے لیے، کوئی چرندوں کے لیے (لیکن ہر چیز کا فائدہ آخر کار انسان کو ملتا ہے۔ مثلاً گھاس پھونس ظاہراً چوپایوں کی غذا ہیں لیکن ان چوپایوں کا گوشت، دودھ اور کھال، انسانوں کے کام آتی ہے)۔ قابل توجہ بات یہ بھی ہے کہ یہاں ہر چیز ایک خاص مقدار میں ہمیشہ مہیا رہتی ہے۔"

نوٹ: ماحولیات کا علم

امام علیہ السلام نے اپنی گفتگو کے آغاز میں مخلوقات اور ان کے درمیان رشتوں کی بات کی تھی؛

اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ سائنس دانوں، ماہرینِ ماحولیات وحیاتیات نے پندرھویں صدی عیسوی کے بعد کئی صدیوں کی تحقیق وجستجو اور بے شمار تجربات سے معلوم کیا کہ دنیا میں ہر چیز، ہر مخلوق رشتوں کی ایک نادیدہ زنجیر سے منسلک ہے۔ انھی معلومات کی بنیاد پر ماحولیات (ایکولوجی) کا علم وجود میں آیا۔ آج دنیا بھر کے سائنس دان اور حکومتیں رشتوں کی اس زنجیر کو بچانے کے لیے تحقیق پر کھربوں ڈالر خرچ کر رہی ہیں۔

رشتوں کی زنجیر

اللہ کی مخلوقات کے درمیان یہ رشتے کیا ہیں اور ان کی کیا اہمیت ہے؟ اسے ایک واقعے سے سمجھا جا سکتا ہے۔

1958ء میں لندن کے ایک قصبے کے رہنے والوں نے محسوس کیا کہ اس موسم میں ہر سال نیلے رنگ کی تتلیاں نظر آیا کرتی تھیں، جو اس دفعہ نظر نہیں آئیں۔ قصبے والوں نے اس کی اطلاع حکومت کو دی۔ حکومت نے ماہرین ماحولیات سے کہا۔ انہوں نے اس قصبے کا دورہ کرنے کے بعد رپورٹ پیش کی اور بتایا کہ گھاس کے میدانوں میں رہنے والے خرگوش کسی بیماری کی وجہ سے بڑی تعداد میں مر گئے ہیں اسی لیے نیلی تتلیاں اس سال پیدا نہیں ہوئیں۔

یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آسکی کہ خرگوشوں کے مرنے سے تتلیوں کا کیا تعلق ہو سکتا ہے!

ماہرین ماحولیات نے بتایا کہ نیلی تتلیاں گھاس کے پتوں پر انڈے دیا کرتی تھیں۔ گھاس کے نیچے رہنے والی چیونٹیاں تتلیوں کے انڈوں کو اٹھا کر نیچے لے جاتی تھیں جہاں ایک خاص درجۂ حرارت برقرار رہتا تھا جو تتلیوں کے انڈوں سے لاروا بننے کے لیے ضروری تھا۔ اس سال یہ ہوا کہ جنگلی خرگوشوں میں ایک بیماری پھیل گئی اور وہ بڑی تعداد میں مر گئے۔ یہ جنگلی خرگوش گھاس کو کھاتے رہتے تھے جس کی وجہ سے گھاس لمبی نہیں ہو پاتی تھی۔

خرگوش مرے تو گھاس لمبی ہو گئی، گھاس لمبی ہوئی تو زمین کا درجہ حرارت گر گیا۔ چیونٹیاں جس درجۂ حرارت میں رہنے کی عادی تھیں اس درجہ حرارت میں کمی آگئی۔ اس وجہ سے چیونٹیاں اس

علاقے کو چھوڑ کر چلی گئیں۔

اس سال نیلی تتلیوں نے گھاس کے پتوں پر انڈے تو دیئے لیکن انہیں نیچے ایک خاص درجۂ حرارت کے علاقے تک پہنچانے والی چیونٹیاں وہاں موجود نہیں تھیں۔ گھاس کے پتوں پر درجہ حرارت زیادہ تھا اس وجہ سے تتلیوں کے انڈوں سے بچے نہیں نکل سکے اور اسی سبب سے اس سال نیلی تتلیاں قصبے میں نظر ہی نہیں آئیں۔

یہ ہے رشتوں کی وہ زنجیر جس کے سبب زمینی ماحول میں توازن قائم ہے اور دنیا میں اللہ کی مخلوقات زندہ رہتی ہیں۔ (حوالہ: How Nature Works)

یہ حُسنِ ترتیب اور ہم آہنگی

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"مفضل! دنیا (کے ماحول) میں یہ حسنِ ترتیب اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ تمام دنیا (یہ ساری کائنات) اس میں موجود مخلوقات مثلاً (حیوانات' نباتات' جمادات) کا کوئی پیدا کرنے والا ہے اور مخلوقات کے درمیان ایک خاص طرح کی ہم آہنگی یہ ثابت کرتی ہے کہ سب کا پیدا کرنے والا ایک ہی ہے۔ جس نے مخلوقات کو ایک مقدار اور معین شدہ منصوبے کے تحت پیدا کیا' انہیں ایک دوسرے سے ہم آہنگ کیا' ایک دوسرے کی ضرورت بنایا۔ اگر اس دنیا کے پیدا کرنے والے ایک سے زیادہ ہوتے تو نظم کائنات میں یہ ہم آہنگی کسی صورت برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔"

باب : 2

اگر یہ لوگ اپنے وجود ہی پر غور کر لیتے!

امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل ابن عمرؓ سے فرمایا:

"دیکھو مفضل جیسا کہ میں نے اپنی گفتگو کے آغاز میں کہا تھا کہ اللہ کی ذات کا انکار کرنے والے اگر خود اپنے وجود پر ہی غور کر لیتے تو اللہ تعالیٰ کو ماننے پر مجبور ہو جاتے لیکن محدود، سنی سنائی اور ناقص معلومات اور اپنی بات پر جمے رہنے کی ضد کے سبب وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے خلاف روزانہ نئی دلیلیں قائم کرتے ہیں۔"

زندگی کا پہلا مرحلہ

"اب میں تمہارے اور اہل ایمان کے سمجھانے اور ان کے ایمان میں اضافے کے لیے وجود انسانی کی خلقت اور جسم انسانی کی تخلیق و بناوٹ اور اس میں پوشیدہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت کو بیان کرتا ہوں۔

دیکھو انسان کی خلقت کا پہلا مرحلہ تو وہ ہے جب رحمِ مادر میں جنین (Embryo) کی حفاظت اور پرورش ہوتی ہے۔ جبکہ اس وقت یہ جنین (ماں اور باپ کا مخلوط خلیہ) تین طرح کے پردوں میں بند ہوتا ہے۔"

نوٹ: نئے انسان کا آغاز......ایک عظیم معجزہ

ایک نئے انسان کی زندگی کا آغاز ماں اور باپ کے مخلوط خلیے سے ہوتا ہے۔ یہ خلیہ اگرچہ جسم کا سب سے بڑا خلیہ ہوتا ہے لیکن حدِ بصارت میں بھی یہ مشکل داخل ہوتا ہے۔ یہ خلیہ رحمِ مادر کی دیوار سے جا کر چپک جائے تو ایک نئے انسان کی زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے۔

اس خلیے میں اللہ تعالیٰ نے وہ تمام معلومات اسٹور کر رکھی ہوتی ہیں جو اس نادیدہ خلیے کو ایک مکمل انسان بنانے کے لیے ضروری ہیں۔ رحمِ مادر کی دیوار سے چپکتے ہی اس خلیے کو توانائی اور غذا ملنا شروع ہو جاتی ہے۔ اس توانائی کی مدد سے خلیے میں موجود پروگرام کام کرنے لگتا ہے۔

خلیے کے اندر DNA کے دو دھاگے ہوتے ہیں: ایک دھاگا ماں کی طرف سے اور ایک باپ کی طرف سے۔ ان دھاگوں پر ننھیال اور ددھیال کے اندر موجود تمام خصوصیات کوڈز کی شکل میں پائی جاتی ہیں۔

DNA کو آپ کسی بلڈنگ کے نقشے سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ رحمِ مادر کی دیوار سے چپکتے ہی خلیے کا نظام اس نقشے کے مطابق انسان کی تعمیر شروع کر دیتا ہے۔ یہ انسان کن خصوصیات کا حامل ہوگا؟ اس کا جسم کیسا ہوگا؟ سر کہاں بنے گا؟ آنکھیں کہاں لگیں گی؟ ہاتھ پیر کان ناک جگر معدہ پھیپھڑے کس طرح کہاں اور کس میٹریل سے بنیں گے۔ یہ میٹریل کہاں سے آئے گا۔ کس طرح استعمال ہوگا اور کب اس انسان کا بننا رک جائے گا، یہ ساری ہدایات DNA پر موجود ہوتی ہیں۔ اس کے مطابق نئے انسان کی تعمیر اور پھر زندگی بھر اس کی شکست و ریخت اور تعمیر و مرمت اسی پروگرام کے مطابق ہوتی رہتی ہے۔ (حوالہ از: جسم کے عجائبات)

ماں کے خون سے نئی زندگی

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

”ماں کے پیٹ میں موجود بچہ نہ تو اپنی غذا کے لیے کوئی

کوشش کر سکتا ہے اور اگر کسی تکلیف میں مبتلا ہو جائے تو اس تکلیف کو دور کرنے کے لیے بھی کچھ نہیں کر سکتا، نہ کسی چیز سے فائدہ حاصل کر سکتا ہے اور نہ اپنی کسی مشکل کو دور کر سکتا ہے۔ اس وقت ماں کے جسم کا خون اس بچے کی طرف جاری ہوتا ہے اور اسے غذا فراہم کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح پانی نباتات کو غذا فراہم کرتا ہے (پودے بھی پانی کے بغیر غذا استعمال نہیں کر سکتے) ماں کا خون بچے کو اس وقت تک فراہم ہوتا رہتا ہے جب تک اس بچے کی خلقت پوری نہیں ہو جاتی اور اس کے بدن کی جلد اس قابل نہیں ہو جاتی کہ ہوا کا مقابلہ کر سکے اور اس کی آنکھ اس قابل نہیں ہو جاتی کہ روشنی کو دیکھ سکے"۔

نوٹ: بچے کی جلد اور ہوا

امام علیہ السلام نے فرمایا کہ بچہ اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا جب تک اس کی جلد ہوا کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہو جاتی۔ ممکن ہے اس سے مراد فضا کا دباؤ یا اسٹماسفیرک پریشر ہو۔

فضا کا دباؤ ہر انسان کو ہر طرف سے اتنے وزن سے دبا رہا ہے جتنا وزن ایک لاری یا بس کا ہو سکتا ہے۔ لیکن اتنا ہی دباؤ جسم کے اندر سے باہر کی طرف پڑ رہا ہوتا ہے۔ اگر اندر کا دباؤ کم ہو جائے تو پورا جسم اندر کی طرف پچک سکتا ہے۔ (حوالہ: How The Earth Works)

ممکن ہے اس سے مراد ہوا میں موجود جراثیم ہوں۔ اگر بچے کے خون میں وہ اینٹی باڈیز موجود نہ ہوں جو اسے دنیا میں آتے ہی ہر طرف موجود وائرس اور بیکٹریا وغیرہ سے محفوظ رکھتی ہیں تو بچہ پیدا ہونے کے بعد چند دنوں میں موت کا شکار ہو سکتا ہے۔ یہ اینٹی باڈیز پہلے ماں کے خون اور

پھر دودھ کے ذریعے بچے کو فراہم ہوتی ہیں اور اسے فوری تحفظ فراہم کرتی ہیں۔

(حوالہ: How Body Works)

خون، دودھ بن جاتا ہے

امام علیہ السلام نے فرمایا:

''مفضل! جب یہ سب کچھ ہو جاتا ہے تو بچے کی ماں کو درد شروع ہو جاتا ہے جو اسے متحرک اور بے چین کر دیتا ہے، یہاں تک کہ بچہ پیدا ہو جائے اور جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو ماں کا وہ خون جو بچے کو پیدا ہونے سے پہلے غذا فراہم کر رہا تھا' پیدا ہو جانے والے بچے کے لیے شیر مادر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب اس کا ذائقہ بھی بدل جاتا ہے اور رنگ بھی اور اب یہ کچھ اور ہی قسم کی غذا بن جاتا ہے جو اس بچے کے مزاج اور اس کی ضرورت کے مطابق ہوتی ہے۔

بچہ پیدا ہوتے ہی اپنے ہونٹوں پر زبان کو پھرانے لگتا ہے اور ہونٹوں کو حرکت دیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی بھوک کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے لیے بہترین اور تازہ غذا ماں کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔ ماں یہ غذا اسے دینا شروع کر دیتی ہے۔

جب تک اس کا بدن نرم' اس کی آنتیں اور نظامِ ہضم کمزور رہتا ہے اور وہ سخت غذا استعمال کرنے کے قابل نہیں ہو جاتا اس

وقت تک یہ تازہ بہ تازہ غذا (یعنی شیر مادر) بچے کی بھوک مٹانے کے لیے ہر وقت (ماں کے پاس) موجود رہتی ہے۔"

نوٹ: پیدا ہونے کے بعد غذا کی فراہمی

بچے کی فوری غذا اور دوا کے انتظامات بچے کی زندگی کے پہلے لمحے ہی سے شروع ہو جاتے ہیں۔ پلاسینٹا نامی بافتہ جو پانی کی تھیلی کی طرح ہوتا ہے اور جس میں بچہ پیدا ہونے سے پہلے زندگی کے کم و بیش نو ماہ گذارتا ہے، حمل کے پہلے ہی لمحے سے ایک ہارمون خارج کرنے لگتا ہے۔ اس ہارمون کو ایسٹروجن کہا جاتا ہے۔ اس ہارمون کی وجہ سے بچے کے لیے موجود دودھ کے کارخانوں کی صفائی اور پھر اس کے اندر تازہ دودھ کی فراہمی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ دودھ غذا بھی ہوتا ہے اور دوا بھی۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو قدرت اسے غذا حاصل کرنے کا سلیقہ سکھا کر بھیجتی ہے اور اس کے ہونٹوں کی ذرا سی حرکت دودھ کی نہروں کو جاری کر دیتی ہے۔

(حوالہ از: جسم کے عجائبات)

وہ نہیں تھے اور ہو گئے۔

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کرنے والے بھی کبھی ماں کے پیٹ میں تھے۔ بے بس اور کمزور۔ یہ بھی اسی طرح ایک باقاعدہ نظام سے گزر کر انسان کی صورت دنیا میں آئے ہیں۔ انہیں اس سارے نظام اور اس میں موجود اللہ تعالیٰ کی نشانیوں، اس کی مصلحتوں اور مناسبتوں پر غور کرنا چاہیے کہ کس طرح وہ نہیں تھے اور ہو گئے اور اب اپنے پروردگار کے وجود کا انکار کرتے ہیں اور

دلائل طلب کرتے ہیں۔"

اگر بچہ دانتوں کے ساتھ پیدا ہوتا!

"مفضل اب خلقت انسانی پر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔

تم دیکھتے ہی ہو کہ بچہ شیر خواری کی مدت سے گزر کر ہلکی اور نرم غذا کھانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اور بڑا ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ چلنے پھرنے لگتا ہے۔ اب بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ اسے طرح طرح کی مزید غذاؤں کی ضرورت پڑتی ہے تا کہ اس کا جسم نشوونما پائے اور وہ بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی کی منزل تک پہنچے۔ اس کے لیے اب اسے گوشت' سبزیوں' پھلوں اور مختلف اناجوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اپنے نرم مسوڑھوں سے ان غذاؤں کو استعمال نہیں کر سکتا' اس لیے اب اس کے دانت نکلنا شروع ہوتے ہیں۔

یہ دانت اور داڑھیں روٹی' پھلوں' گوشت اور سبزیوں کو کوٹ اور رگڑ کر نرم غذا میں تبدیل کر سکتی ہیں۔ اس بات پر بھی غور کرو کہ یہ دانت اگر شیر خوارگی کی عمر میں نکل آئیں یا بچہ دانتوں اور داڑھوں کے ساتھ پیدا ہوتا تو یہ اس کی عمر اور ضرورت کے مطابق نہ ہوتا اور اس سے ماں اور بچے دونوں کے لیے بڑی مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ اسی لیے دانت اسی وقت نکلتے ہیں جب ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ غور تو کرو کہ یہ سب انتظامات

ایک خاص اندازے اور منصوبے کے تحت کیا مادّہ خود کر سکتا تھا!''

نوٹ: ضرورت کے وقت دانت

پیدائش کے وقت بچے کے منہ میں 52 دانت پوشیدہ ہوتے ہیں۔ یعنی دودھ کے 20 اور مستقل رہنے والے 32 دانت۔ دودھ کے دانت اینمل کوٹنگ کے ساتھ تقریباً مکمل ہو چکے ہوتے ہیں لیکن اس وقت چونکہ بچے کی غذا صرف مشروبات پر مشتمل ہوتی ہے اس لیے یہ دانت مسوڑھوں میں تیار لیکن عارضی طور پر چھپے ہوتے ہیں۔

چھ ماہ کی عمر میں عموماً دودھ کے دانتوں میں سے سامنے کے نیچے کے دو دانت نکلتے ہیں۔ نوکیلے دانتوں کا بے بی ایڈیشن اٹھارہ ماہ کی عمر میں سامنے آتا ہے۔

دودھ کے تمام دانت دو سال کی مدت میں نکل آتے ہیں۔ مستقل رہنے والے دانت اور داڑھیں بارہ سے اٹھارہ سال کی عمر میں نکلتی ہیں۔ دانتوں اور داڑھوں کا کام غذا کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور پھر اسے لعاب دہن کی مدد سے پیس کر ایک طرح کے پیسٹ میں تبدیل کرنا ہے تاکہ زبان اس کا ذائقہ محسوس کر سکے اور یہ غذا زبان کی مدد سے حلق کے اندر اور وہاں سے معدے میں جا سکے۔ بھوک مٹ سکے اور یہ غذا جزوِ بدن بن جائے۔

(حوالہ از: جسم کے عجائبات)

داڑھی کی حکمت

''مفضل دیکھو! یہ بچہ ایک نادیدہ وجود تھا۔ پھر یہ گوشت اور ہڈیوں کا مجموعہ بنا۔ پھر اس میں روح آئی۔ پھر یہ ایک خاص مدت تک ماں کے پیٹ میں رہ کر دنیا میں آیا۔ بچپن سے لڑکپن اور پھر جوانی کی منزل تک پہنچا۔

اب جوان ہونے کی صورت میں مرد اور عورت کی اپنی اپنی شناخت ضروری تھی اس لیے نوجوان کے چہرے پر داڑھی نکلنا شروع ہو جاتی ہے۔ داڑھی کے ذریعے یہ نوجوان ایک مرد کی شکل اختیار کرتا ہے۔

لڑکی ہونے کی صورت میں اس کا چہرہ صاف شفاف رہتا ہے۔ اس کے چہرے پر سخت بال نہیں نکلتے تا کہ چہرے کی تازگی اور حسن برقرار رہے اور مرد کے مقابلے میں اس کی الگ سے شناخت ہو سکے۔''

نوٹ: بالوں کی اقسام

بالوں کی مختلف شکلیں اور سائز ہوتے ہیں اور یہ ہمارے پورے جسم پر موجود ہوتے ہیں۔ بھنوؤں اور پلکوں کے بال چھوٹے اور سخت ہوتے ہیں، سر کے بال لمبے اور نرم، جب کہ جسم کی کھال پر یہ باریک روئیں کی صورت پھیلے ہوتے ہیں۔ سر میں ان کی تعداد تقریباً ایک لاکھ اور داڑھی میں ان کی تعداد تیس ہزار کے لگ بھگ ہو سکتی ہے۔ داڑھی کے بال سال بھر میں ساڑھے پانچ انچ تک بڑھتے ہیں۔ سر کے بال پانچ انچ سالانہ کے حساب سے بڑھتے ہیں۔

بالوں کی جڑیں جلد کی درمیانی تہہ سے باہر نکلتی ہیں۔ ان کی جڑوں کو فولی کل (FOLLICLE) کہا جاتا ہے۔ خواتین میں بھی بالوں کی اسی قدر جڑیں ہوتی ہیں جتنی مردوں کے جسم میں ہوتی ہیں لیکن ان کی جلد کا رواں نرم اور تقریباً نادیدہ ہوتا ہے۔ خواتین کے چہرے پر جسم کا نظام جلد کا ہم رنگ رُواں پیدا کرتا ہے۔ یہاں وہ داڑھی جیسے سخت بال پیدا نہیں کرتا۔

یہ سب کچھ اتفاقیہ نہیں بلکہ ایک پہلے سے بنائے گئے پروگرام کے تحت ہوتا ہے اور یہ پروگرام ہر شخص کی زندگی کے آغاز سے پہلے طے شدہ ہوتا ہے۔ (حوالہ از: جسم کے عجائبات)

اب تک کی گفتگو کا خلاصہ

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"مفضل! اب تک انسان کی خلقت کا احوال جو میں نے تم سے بیان کیا، اس کا مختصراً دوبارہ جائزہ لیں تو بہتر ہوگا۔ انسان کے دنیا میں آنے کی جو حالتیں میں نے بیان کیں؛ یعنی ایک ذرہ (خلیہ) پھر لوتھڑا' پھر گوشت اور ہڈیوں کا مجموعہ' پھر بچہ' بچپن' لڑکپن اور جوانی اور ہر حالت میں انسان کی ضرورت کے مطابق اس کے اعضاء اور صلاحیتوں کا پروان چڑھنا......

تو کیا یہ سارے انتظامات کسی خالق و مدبر کے بغیر ہوتے رہے؟

کیا تم سمجھتے ہو کہ جب بچہ رحمِ مادر میں تھا اس وقت اگر ماں کے خون کے ذریعے اسے غذا فراہم نہ کی جاتی تو وہ زندہ رہ سکتا تھا؟

اس وقت اس کمزور اور بے بس بچے کو (باہر دنیا میں موجود) بہترین غذائیں ماں کے خون کے ذریعے فراہم نہ کی جاتیں تو وہ بچہ اس پودے کی طرح سوکھ نہ جاتا جسے پانی نہ مل سکا ہو اور اگر بچے کی ماں کو مقررہ وقت پر درد بے چین نہ کرتا تو بچہ کس طرح دنیا میں آتا؟ ایسی صورت میں وہ بچہ اسی طرح رحمِ مادر میں زندہ دفن ہو جاتا جیسے کسی زمانے میں بچے زندہ زمین میں دفن کر دیے جاتے تھے"۔

نوٹ: آکسی ٹوسن نامی ہارمون

ہمارے دماغ میں بیر کے برابر ایک غدود ہے جسے پیچوٹری گلینڈ کہا جاتا ہے۔ بچے کی پیدائش کے لمحوں سے ذرا پہلے یہ غدود ایک ہارمون جاری کرتا ہے۔ اس ہارمون کو آکسی ٹوسن (Oxytocin) کہا جاتا ہے۔ یہ ہارمون بچے کی پیدائش سے پہلے شکمِ مادر کے عضلات میں کھنچاؤ پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں بچہ شکمِ مادر کی تہہ بہ تہہ تاریکیوں سے نکل کر اس دنیا کی روشنیوں میں آ جاتا ہے۔ اگر بڑے آپریشن کی سہولت موجود نہ ہو اور یہ آکسی ٹوسن ہارمون بھی دماغ کے حکم سے جاری نہ ہو تو ایسی صورت میں ماں کا پیٹ بچے کی قبر میں تبدیل ہو سکتا ہے۔

(حوالہ از: جسم کے عجائبات)

تو کیا ایک بے شعور مادے میں یہ صلاحیت ہو سکتی ہے کہ اسے بچے کی پیدائش کے وقت کا پتا چل جائے اور وہ اس خاص وقت میں مذکورہ ہارمون کو جاری کرے اور ہر انسان کی پیدائش کے لیے ہر عمر اور مرحلے میں اس قدر حیران کن اقدامات کر سکے؟

یہ مصلحتیں اور باریکیاں

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"مفضل اس بات پر بھی غور کرو کہ بچے کے پیدا ہونے کے بعد اس کے مزاج اور ضرورت کے مطابق اس کی غذا (ماں کا دودھ) موجود نہ ہوتی تو وہ کس طرح زندہ رہتا۔

اگر ایک خاص وقت پر بچے کے دانت نہ نکلتے تو وہ روٹی، گوشت، پھلوں اور سبزیوں کو کس طرح کھا سکتا تھا اور اگر نہ کھاتا تو اس کی نشو و نما کس طرح ممکن تھی؟

اگر مرد و عورت ایک جیسے ہوتے تو ان کی شناخت اور ان
کے درمیان ایک دوسرے کے لیے کشش کس طرح پیدا ہوتی؟
تو مفضل! اب تم دیکھو کہ کیا بغیر کسی پیدا کرنے والے کے
یہ سب تدبیریں، یہ مصلحتیں اور یہ باریکیاں ممکن تھیں! تو یہ کہنا کہ
کوئی پیدا کرنے والا نہیں ہے، یہ سب کچھ بس خود بہ خود پیدا ہو
گیا، ایک احمقانہ سوچ کے سوا کچھ نہیں۔ یہ ملحدین جو کچھ کہتے ہیں،
اللہ تعالیٰ اس سے بہت برتر ہے۔"

اس کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل ابن عمرؒ ایک بڑی
حیران کن حقیقت کی طرف متوجہ کیا اور پوچھا۔

"مفضل! تم نے کبھی سوچا کہ انسان کا بچہ کامل عقل کے
ساتھ پیدا ہوتا تو کیا ہوتا؟"

(یعنی مچھلی اور مرغی وغیرہ کے بچے تو پیدا ہوتے ہی تیرنا اور اپنے
قدموں پہ کھڑا ہونا سیکھ جاتے ہیں جب کہ انسان کا بچہ بہت عرصے تک
ماں باپ کا محتاج رہتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟)

اس سوال کا جواب اگلے باب میں ملاحظہ فرمائیں۔

باب: 3

اگر انسان کا بچہ کامل عقل کے ساتھ پیدا ہوتا!

انسان کی زندگی کے مختلف مراحل اور ہر مرحلے میں اس مرحلے کی مناسبت سے اس کی زندگی کی بقا کے انتظامات یہ ثابت کرتے ہیں کہ انسان اور اس کائنات کا کوئی پیدا کرنے والا ہے۔ کوئی اس کا خالق ہے اور وہ اکیلا ہی خالق و مالک ہے۔ کیوں کہ اگر خالق و مالک دو ہوتے تو انسانی زندگی اور اس پوری کائنات میں ہر جگہ تضاد و اختلاف پیدا ہوتا رہتا۔

اسی حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل ابن عمرؓ سے فرمایا کہ انسان کا بچہ اگر کامل عقل کے ساتھ پیدا ہوتا تو کیا ہوتا؟

مفضل ابن عمرؓ نے عرض کی: "آقا! آپ رہنمائی فرمائیں۔ یہ عجیب سوال ہے میں نے پہلے اس پر توجہ نہیں دی۔"

امام علیہ السلام نے تبسم فرمایا اور کہا۔

> "انسان کے بچے کے کامل عقل کے ساتھ پیدا نہ ہونے میں اللہ تعالیٰ کی ایسی (ظاہر و پوشیدہ) مصلحتیں ہیں جن پر غور کیا جانا چاہیے۔"

پہلی مصلحت

> "انسان کا بچہ اگر کامل عقل وشعور کے ساتھ پیدا ہوتا تو اس دنیا میں آ کر وہ حیران اور مدہوش ہو جاتا۔ وہ اچانک ہی ایسی چیزوں کو دیکھتا جنہیں اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس وجہ

سے ممکن ہے وہ پیدا ہوتے ہی خوف سے مر جاتا۔ بڑے بڑے درخت، پرندے، انسانوں کے چہرے، طرح طرح کی آوازیں، دروازے، کھڑکیاں یہ سب چیزیں اس نے کبھی دیکھی ہی نہیں تھیں...... وہ انہیں دیکھ دیکھ کر پریشان اور خوف زدہ ہو جاتا۔ وہ ماں کے پیٹ کی تہہ در تہہ تاریکیوں اور ایک مختصر سی جگہ میں رہنے کا عادی تھا۔ اب اچانک اس کی آنکھ کھلتی تو یہاں اسے ایک بالکل ہی اور طرح کی دنیا نظر آتی۔ ان سب چیزوں کو برداشت کرنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا۔

مفضل! تم اس بات کو اس طرح بھی سمجھ سکتے ہو کہ اگر کوئی زیادہ عمر کا آدمی کسی غیر ملک میں جا کر رہنا چاہے تو وہ اس اجنبی ماحول، اجنبی زبان، اجنبی لوگوں، رسم و رواج اور وہاں کے قواعد و ضوابط کو دیکھ کر سخت پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ نہ وہاں کی زبان جلدی سیکھ سکتا ہے اور نہ وہاں کے ماحول میں جلدی گھل مل سکتا ہے۔

اس کے برعکس جو افراد لڑکپن یا بچپن میں کسی غیر ملک میں جا کر رہنے لگیں تو بہت جلد وہاں کی زبان بھی سمجھنے لگتے ہیں اور وہاں کے رسم و رواج کو سیکھ کر وہاں کے ماحول میں گھل مل جاتے ہیں۔" (مفہومِ قول)

اسی طرح بچہ اگر کامل عقل و شعور کے ساتھ پیدا ہوتا اور آنکھیں کھلتے ہی اچانک اس دنیا کی عجیب عجیب چیزیں' طرح

طرح کی صورتیں اور قسم قسم کی آوازیں سنتا تو سخت تعجب میں رہتا اور ایک مدت تک اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ یہ میں کہاں آ گیا ہوں اور یہ جو چیز میں دیکھ رہا ہوں یہ کیا ہے۔

انسان کے بچے کو ابتدا میں کم عقل و شعور کے ساتھ پیدا کرنے میں ایک حکمت تو یہ ہے جو میں نے بیان کی"۔

دوسری مصلحت

"انسان کا بچہ اگر کامل عقل کے ساتھ پیدا ہوتا تو جس طرح وہ پیدا ہوا اور پھر جس طرح اسے نہلایا دھلایا اور کپڑوں میں لپیٹا جاتا ہے۔ کوئی اسے پیار کرتا ہے' کوئی اسے گود میں اٹھاتا ہے' کبھی اسے زبردستی دوا دی جاتی ہے' کبھی رفع حاجت کے بعد اسے دھلایا جاتا ہے..... اب اس کی عقل تو کامل ہے۔ سب باتوں کو سمجھ رہا ہے لیکن جسمانی طور پر اس قابل نہیں کہ خود اپنی مرضی سے کوئی کام کر سکے تو وہ بچہ بے بسی کا شکار ہو جاتا۔

اسے خود اپنے آپ سے نفرت و کراہیت محسوس ہونے لگتی۔ وہ انتہائی ذلت و شرمندگی محسوس کرتا کہ میں نہ خود اپنی بھوک مٹا سکتا ہوں نہ غلاظت کو دور کر سکتا ہوں۔ نہ کپڑے پہن سکتا ہوں نہ اتار سکتا ہوں۔ نہ اپنی مرضی سے کہیں جا سکتا ہوں۔ نہ آ سکتا ہوں۔"

(یہ سب باتیں بچے کی نفسیات پر انتہائی مضر اثرات مرتب کرتیں)

تیسری مصلحت

امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل ابن عمرؓ سے فرمایا:

بچے کو کم عقل کے ساتھ پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی تیسری مصلحت یہ ہے کہ اگر بچہ کامل عقل کے ساتھ پیدا ہوتا تو اس کے اندر وہ معصومیت نہ ہوتی جس کی وجہ سے ماں باپ اور دوسرے محبت کرنے والے ایک معصوم اور بھولے بھالے سے بچے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اسے پیار اور محبت سے پالتے ہیں۔ بچوں کی معصومیت، مسکراہٹ اور ان کی معصومانہ حرکتوں سے محظوظ ہوتے ہیں۔ بچوں کے بھولپن ہی کی وجہ سے دلوں میں ان کے لیے ایک خاص میلان اور رجحان پیدا ہوتا ہے۔

بچہ اگر پیدا ہوتے ہی بڑی بڑی باتیں اور بڑوں جیسی حرکتیں کرنے لگتا تو اس کے پالنے والے بہت جلد اس سے بے زار ہو جاتے اور یہ بات بچے کے لیے سخت نقصان دہ ہوتی۔

ماں باپ بچے کی پرورش میں خوشی کے بجائے رنج و تکلیف محسوس کرتے۔ ماں باپ دراصل بچے کی اسی معصومیت اور بھول پن کے سبب ہر وقت اس کا خیال رکھتے ہیں ہر وقت اسی کے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ اس کی نگہداشت میں ایک خاص طرح کا لطف محسوس کرتے ہیں لیکن اگر بچہ کامل عقل کے

ساتھ پیدا ہوتا تو وہ بار بار شور مچاتا (کہ مجھے کیوں نہلایا جا رہا ہے۔ آخر یہ جھولے میں مجھے کیوں جھلایا جا رہا ہے)۔ بچہ اپنی عقل چلاتا تو والدین بہت جلد اس سے اکتا جاتے۔"

چوتھی مصلحت

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"بچے کو کم عقل کے ساتھ پیدا کرنے میں اللہ رب کریم کی چوتھی مصلحت یہ ہے کہ اگر بچہ کامل عقل کے ساتھ پیدا ہوتا تو ان وجوہات کی بنا پر (جو میں نے پہلے بیان کی ہیں) نہ ماں باپ کے دل میں اولاد سے محبت پیدا ہوتی اور نہ اولاد ماں باپ سے محبت محسوس کرتی ۔ ماں باپ تو اس کی نگہداشت، صحت، صفائی، زندگی اور پرورش کے لیے اس کی خدمت کرتے اور بچہ پکی عقل ہونے کے سبب ان باتوں سے چڑتا رہتا اور ان سے نفرت محسوس کرتا۔

اس لیے جیسے ہی بچہ چلنے پھرنے کے قابل ہوتا' وہ (بہت کم عمری میں) ماں باپ سے الگ ہو جاتا تاکہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارے۔ یہ بچہ ماں باپ اور اپنے گھر والوں سے الگ ہو کر معاشرے میں کہیں گم ہو جاتا (جیسے بلی اور کتے کے بچے ذرا بڑے ہو کر گلی کوچوں میں کہیں کھو جاتے ہیں۔)

پھر عمر گزرنے اور بڑے ہونے کے بعد نہ وہ شخص ماں باپ کو پہچانتا نہ بہن بھائی کو۔ نہ حلال رشتوں کو نہ حرام رشتوں کو (اس سے معاشرے میں جو خرابی پیدا ہوتی اس کا تصور کسی حد تک ہی کیا جاسکتا ہے۔)

پانچویں مصلحت

امام علیہ السلام نے فرمایا:

''بچے کے باعقل و شعور پیدا ہونے میں جو کم سے کم' اگرچہ یہ سب سے بڑی قباحت اور سخت مکروہ بات ہے وہ یہ کہ بچہ جب پیدا ہوتا تو وہ سب کچھ دیکھتا جسے دیکھنا جائز نہیں تھا'' (اور اس کے نفسیاتی اثرات بچے کی شخصیت کو بری طرح متاثر کرتے)۔

ان تمام وجوہات اور مصلحتوں کے سبب اللہ تعالیٰ نے یہ نظام بنایا ہے کہ انسان کا بچہ دنیا میں اس طرح آئے کہ ابتدائی دنوں میں اس کی بے شمار صلاحیتیں خوابیدہ رہیں۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو۔ جو چیزیں دیکھے انہیں اپنی ناقص عقل کے ساتھ دیکھے اور ان کا بھرپور شعور حاصل نہ کرسکے تاکہ نہ وہ حیران و پریشان ہو اور نہ خوف زدہ۔

پھر رفتہ رفتہ اس کی عمر اور ضروریات کے مطابق اس کی عقل بڑھتی ہے۔ اس کا شعور اور اس کی صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں تاکہ وہ اس دنیا کی چیزوں کا بتدریج عادی ہوتا رہے۔ آہستہ آہستہ

تمام چیزوں سے مانوس ہوتا جائے اور پھر اس پر قائم رہے۔ پھر وہ اطمینان کے ساتھ اپنے مشاہدے تجربے اور عقل کے ساتھ زندگی گزارنے کا سلیقہ سیکھے۔ بتدریج خیر و شر، نفع نقصان، نیکی بدی اور اچھائی برائی کے درمیان تمیز کر سکے۔

اب یہ بتاؤ مفضل کہ کیا انسان کی خلقت میں یہ اہتمام، یہ منصوبہ بندی، یہ مصلحتیں، یہ حکمتیں کیا بے جان مادّہ پیدا کر سکتا ہے؟

تم دیکھو کہ انسان کی خلقت کا ہر مرحلہ، ہر شے کس قدر بہترین انداز سے طے شدہ ہے۔ کہیں کوئی غلطی کوئی خطا نظر نہیں آتی۔ تو اللہ کو نہ ماننے والوں کے لیے کیا صرف یہ ایک ہی دلیل کافی نہیں ہے کہ وہ گمراہی سے نکل کر راہ راست پر آ جائیں۔"

نوٹ: محدود عقل لامحدود امکانات

بظاہر یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ انسان جسے اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے وہ زندگی کے ابتدائی ایام میں دوسروں کا محتاج ہوتا ہے اور کسی چیز کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ "ہم نے تمہیں ماؤں کے شکم سے اس طرح نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے (قرآن)۔"

اس کے برعکس کئی مخلوقات مثلاً مچھلی، مرغی، بطخ وغیرہ کے بچے خطرے سے بچنے، رزق تلاش کرنے، تیرنے یا بھاگنے دوڑنے کے "علم" کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔

اس کی وجہ بہت واضح ہے۔ دیکھیے مرغی یا مچھلی کے بچے محدود عقل کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں، اس لئے کہ ان کا کردار اس کائنات یا اس دنیا میں بہت محدود ہوتا ہے۔ اسی سبب سے ان کا علم بھی محدود رہتا ہے۔

اگر انسان کا بچہ کامل عقل کے ساتھ پیدا ہوتا!

انسان کا بچہ محدود علم کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور بہت عرصہ ماں باپ کا محتاج رہتا ہے لیکن اس کا علم اور اس کی عقل وقت کے ساتھ بڑھتی ہی رہتی ہے اس لیے کہ اسے اس دنیا میں عظیم الشان کارنامے سرانجام دینا ہوتے ہیں۔

مثلاً اگر کسی شخص کو صرف پاپڑ تل کر بیچنا ہیں تو اسے زیادہ علم یا تجربے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص مائیکروسوفٹ انجینئر بننا چاہتا ہے تو اسے بتدریج علم حاصل کرنا ہوگا۔ ہر کلاس میں بہترین کارکردگی دکھانا ہوگی۔ وہ فزکس ریاضی اور کمپیوٹر سائنس پڑھے گا تب کہیں جا کر مائیکروسوفٹ انجینئر بن سکے گا۔

بہت سے جانداروں کے بچے محدود علم کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اور محدود عقل کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔ انسان جاہل پیدا ہوتا ہے لیکن علم و عقل کے لامحدود امکانات کے ساتھ۔

باب: 4

بچے روتے کیوں ہیں؟

امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل بن عمر سے فرمایا:

''کیا تم نے غور کیا کہ بچے روتے کیوں ہیں؟ بچے روتے ہیں اور والدین چاہتے ہیں کہ وہ نہ روئیں۔ بچے کے رونے میں اس کے لیے جو فائدہ ہے، اسے والدین نہیں جانتے۔ وہ بچے کو خاموش کرنے کے لیے اس کی خوشی کے مطابق کام کرتے ہیں تا کہ وہ نہ روئے۔

حقیقت یہ ہے کہ رونا بچے (یا شاید کچھ بچوں) کے لیے بے حد مفید ہوتا ہے۔ دراصل بچوں (یا شاید کچھ بچوں) کے دماغ میں رطوبت ہوتی ہے جو اگر اس میں رہ جائے تو ان بچوں کو کوئی طرح کی بیماریوں یا کسی قسم کی معذوری کا سامنا کرنا پڑے۔ مثلاً ان کی بینائی ختم ہو جائے یا سماعت میں خرابی پیدا ہو جائے۔ والدین بچوں کے رونے کو برا سمجھتے ہیں اور نہیں جانتے کہ رونا ان بچوں کے لیے کس قدر سود مند ہے۔

اسی طرح دنیا میں ممکن ہے ایسی بہت سی بہ ظاہر نا گوار باتیں ہوں جنھیں یہ دہریے دیکھتے ہوں لیکن ان کے پیچھے چھپی ہوئی

اللہ تعالیٰ کی مصلحتوں اور ان کے فائدوں کو نہ جانتے ہوں۔ اگر وہ ان باتوں کو سمجھتے اور ان کے فائدوں کو سمجھتے تو اپنی کم علمی کے سبب یہ نہ کہتے کہ اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بہرحال جن باتوں کو یہ دہریے نہیں جانتے' انہیں اللہ کی معرفت رکھنے والے جانتے ہیں۔"

نوٹ: درد اور تکلیف

درد اور تکلیف یا بہت سی مشکلات اور ناگوار باتوں کو کوئی بھی شخص پسند نہیں کرتا۔ لیکن سمجھ دار لوگ جانتے ہیں' ماہرین حیاتیات کو علم ہے کہ یہ درد' تکلیف اور زندگی کی مشکلات جو ہمیں بہ ظاہر بری لگتی ہیں، بہ باطن یہ اللہ رب کریم کی عظیم نعمتیں ہیں۔

مثلاً جسم کے اندر کسی بھی قسم کا درد خود کوئی بیماری نہیں بلکہ کسی عضو میں پیدا ہونے والی خرابی کا سگنل ہوتا ہے اور انسان کو معالج تک لے جانے کا سبب بن جاتا ہے۔ جن لوگوں کو درد محسوس نہیں ہوتا وہ کسی دن اچانک ہی دنیا سے گزر جاتے ہیں۔

اس کے لیے صرف ایک مثال پر اکتفاء کریں گے کہ جن لوگوں کو شوگر کی بیماری ہوتی ہے اور اس کے ساتھ انہیں ہائی بلڈ پریشر بھی ہو تو انہیں دل کا درد محسوس ہی نہیں ہوتا۔ انہیں ہلکے ہلکے ہارٹ اٹیک ہوتے رہتے ہیں لیکن اکثر اوقات انہیں پتا نہیں چلتا۔ جب درد محسوس نہیں ہوتا تو وہ ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں جاتے اور اس طرح اپنی بیماری سے غافل رہتے ہیں اور پھر اچانک ہی کسی دن اس دنیا سے گزر جاتے ہیں۔

اسی طرح مشکلات اور ناگوار باتیں انسانوں کو گناہوں سے روکتی ہیں اور دنیا کی رنگا رنگی سے نکال کر انہیں اللہ رب کریم کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ اس کے جو فائدے ہیں انہیں ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔

بچوں کے منہ سے رال بہنا

امام جعفر صادقؑ نے مفضل بن عمرؓ کو ایک اور بات بتائی۔ آپؑ نے فرمایا:

''اسی طرح بچوں کے منہ سے رال بہنے کا معاملہ ہے۔ یہ وہ رطوبت ہے جو اگر جسم کے اندر رہ جائے تو بڑے بڑے امراض مثلاً فالج، لقوہ، کم عقلی، پاگل پن جیسے امراض کا سبب بن سکتی ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے جسم کے اندر ایسا (خودکار) نظام بنایا ہے کہ یہ رطوبت یعنی رال بچوں کے منہ سے بہتی رہتی ہے تا کہ جب یہ بچے بڑے ہوں تو صحت مند رہیں (یعنی بڑے ہونے کے بعد نارمل ہوں، ایب نارمل بچے نہ ہوں)۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ ایک ایسی عظیم نعمت بخشی ہے جس کی قدر و قیمت کو عام لوگ نہیں سمجھ پاتے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعے انہیں زندگی بھر کے لیے ان مشکلات و امراض سے بچایا ہے جن کا یہ ادراک نہیں کر سکتے۔''

نوٹ: بچوں کا رونا، رال بہنا

یہ بات تو ایک عام آدمی بھی جانتا ہے کہ بچے کا پیدا ہونے کے فوراً بعد رونا اس کی زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ پیدا ہونے والا بچہ فوراً ہی چیخ مار کر رونا شروع کر دیتا ہے۔ چیخ مارنے اور پھر رونے کے عمل سے اس کے پھیپھڑے کام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اس سے پہلے ماں کے پیٹ میں وہ ماں کے پھیپھڑوں کے ذریعے سانس لے رہا ہوتا ہے۔ ولادت کے فوراً بعد ضروری ہے کہ اس کے اپنے پھیپھڑے سانس لینے اور باہر نکالنے کا کام شروع کریں۔ اسی لیے بچہ پیدا ہوتے ہی رونا شروع کرتا ہے۔ اس طرح آکسیجن زیادہ مقدار میں اس کے پھیپھڑوں میں پہنچتی ہے اور پھر اس کے پھیپھڑے تاحیات ایک خودکار نظام کے تحت کام کرتے رہتے ہیں۔

امام علیہ السلام کا ارشاد اور میڈیکل سائنس

ولادت کے فوراً بعد بچے کے رونے اور منہ سے رال بہنے کی حکمت کے بارے میں ماہرین حیاتیات کو جو معلومات ملی ہیں وہ اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں حاصل ہوئی ہیں جب کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے کم و بیش ساتویں صدی عیسوی میں اس زمانے کے لوگوں کی عقل کے مطابق مختصراً ان حقائق کے بارے میں بتادیا تھا۔

آج کے دور 2012ء میں ماہرین حیاتیات اور معالجین کے مطابق بچے کے زیادہ رونے میں کوئی فائدہ نہیں سوائے اس کے کہ اس کا رونا بچے کی کم غذائیت یا اس کے جسم میں کسی اندرونی بیماری کی نشان دہی کرتا ہے۔ (آپ غور فرمائیں کہ کیا یہ کم فائدہ ہے؟)

ڈاکٹروں کے مطابق رونے سے جو آنسو بہتے ہیں وہ دراصل ایک جراثیم کش مادّے لائی سوزائم (Lysozyme) پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ مادہ جراثیم کش ہوتا ہے۔

جراثیم آنکھوں میں طرح طرح کی بیماریاں پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ جراثیم کش مادہ دونوں آنکھوں کے اگلے حصے میں موجود غدود میں تیار ہوتا ہے اور ہر مرتبہ جب ہم پلک جھپکتے ہیں تو یہ مادہ پوری آنکھ پر پھیل کر اسے جراثیم سے صاف کر دیتا ہے اس کے بعد ہر مرتبہ یہ مادہ آنکھ کے ناک کی جانب والے حصے میں موجود ایک مقام پر جذب ہوتا رہتا ہے۔

امام علیہ السلام نے فرمایا کہ دماغ میں رطوبت ہوتی ہے جو رونے سے خارج ہوجاتی ہے۔ (ہمیں اپنی کم علمی کا اعتراف ہے اور عربی کی اصل عبارت سامنے نہیں ہے کہ فیصلہ کرسکیں کہ امام نے ''دماغ'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے یا ''جسم'' کا۔ ممکن ہے یہاں مترجم کو غلط فہمی ہوئی ہو)۔

آج کے ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ یہ رطوبت دماغ میں نہیں ہوتی بلکہ اسے دماغ کے حکم پر آنکھوں پر موجود لکریمل گلینڈز تیار کرتے ہیں۔ بہرحال ماہرین اس حقیقت کو مانتے ہیں کہ آنکھوں میں یہ آنسو یا جراثیم کش رطوبت نہ ہو تو انسان کی بینائی تک ختم ہو سکتی ہے۔

بچوں کی رال بہنے میں ماہرین حیاتیات کے نزدیک ابھی تک دو فائدے ہیں۔ یہ رال بھی جراثیم کش ہے اور غذا کھانے اور اسے ہضم کرنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ اسے ہم عام طور پر لعاب دہن کہتے ہیں لیکن اس کی قدر و قیمت کا معمولی سا بھی ادراک نہیں رکھتے۔ یہ رطوبت منہ حلق اور حلق سے معدے تک جانے والی نالی میں موجود رہتی ہے۔ اس رطوبت کو سلائیوا کہا جاتا ہے۔ اس کے بغیر ہم روٹی کا نوالہ تو کیا سونف کا ایک دانہ تک حلق سے نہیں اتار سکتے۔ ہماری غذا جب اس رطوبت کی مدد سے نیم سیال میں تبدیل ہوتی ہے تب ہم کسی غذا کا ذائقہ محسوس کر پاتے ہیں۔ یہ رطوبت منہ اور زبان پر موجود غدود سے پیدا ہوتی ہے۔

ماہرین حیاتیات کے مطابق منہ کی رطوبت نہ ہو یا بہت کم ہو تو ایسی صورت میں منہ کا السر اور دانتوں کی کئی بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ آج کے ماہرین کے مطابق اس رال کے بہنے یا نہ بہنے سے کم عقلی، پاگل پن، فالج یا لقوے کی بیماری کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ معلومات حتمی نہیں

میڈیکل سائنس بہرحال تحقیق و جستجو میں مصروف ہے۔ ممکن ہے آئندہ زمانوں میں ماہرین حیاتیات اس حقیقت کو معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائیں جس کی طرف امام جعفر صادق علیہ السلام نے اشارہ فرمایا ہے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ہمارے دماغ میں موجود ایک غدود جسے پیچوٹری گلینڈ کہا جاتا ہے، اس کے لیے انیسویں صدی کے آغاز تک ماہرین حیاتیات کی معلومات بہت محدود تھیں۔ ان کے خیال میں اس غدود کا کام صرف ناک میں پیدا ہونے والی جراثیم کش رطوبت کو پیدا کرنا تھا لیکن جب انیسویں صدی کے نصف آخر میں نئے اور جدید آلات ایجاد ہوئے اور تحقیق کے نئے راستے

کھلے تو معلوم ہوا کہ پیچوٹری گلینڈ اپنے ہارمونز کے ذریعے جسم کے تمام غدود کو کنٹرول کرتا ہے اور ایسے ہارمون خارج کرتا ہے جن کی عدم موجودگی کی صورت میں پورا جسم گوشت اور ہڈیوں کے ڈھیر میں تبدیل ہوسکتا ہے۔ آج اسی پیچوٹری گلینڈ کو جسم کا ماسٹر گلینڈ کہا جاتا ہے۔ اس گلینڈ کا سائز بیر کے برابر اور یہ 85% پانی پر مشتمل ہوتا ہے۔ (حوالہ: جسم کے عجائبات)

اگر یہ نعمتوں کو جانتے اور غور کرتے......

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

''اگر یہ لوگ (یعنی وجودِ خدا کا انکار کرنے والے) خود اپنے ہی جسم میں موجود اللہ تعالیٰ کی ان تمام نعمتوں (اعضاء اور ان کی کارکردگی) کو جانتے (یا کسی سمجھانے والے کی بات پر کان دھرتے، اس کی بات پر یقین کرتے، اس پر ایمان لے آتے) تو کبھی بھی کفر جیسے گناہ میں مبتلا نہ ہوتے۔

پس ہم اللہ تعالیٰ ہی کی حمد و ثناء بیان کرتے ہیں اور عظمت و بزرگی اسی ربِ کریم کے لیے مخصوص ہے جس نے مستحق اور غیر مستحق کو یہ نعمتیں عطا فرمائیں۔ اس کی ذات ان باتوں سے بالا تر ہے جن باتوں کو یہ منکر خدا بیان کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ خود بہ خود پیدا ہو گیا ہے بغیر کسی خالق و صانع کے۔ شاید اب بھی یہ غور کریں، معرفت حاصل کریں اور خدا شناس بن جائیں۔''

باب: 5

انسانی اعضا کی خلقت

امام جعفر صادقؑ نے مفضل ابن عمرؓ سے فرمایا:

"مفضل ذرا غور تو کرو کہ انسانی جسم کے اعضاء کیوں بنائے گئے؟ ان کی ضرورت کیا تھی؟ اور یہ اعضاء کیا خدمات سرانجام دیتے ہیں؟ ان اعضاء کو بنانے میں اور ہر عضو کو ایک خاص مقام پر پیدا کرنے میں اللہ تعالٰی کی کیا مصلحت ہے اور انسانوں کے لیے اس میں کس قدر آسانیاں اور سہولتیں موجود ہیں؟ کیا زمانہ، مادّہ یا فطرت (نیچر) میں یہ شعور ہے کہ وہ ایک خاص منصوبہ بندی کے ساتھ اس انسانی جسم کی تعمیر کر سکے؟

اچھا! دیکھو دو ہاتھ تو کام کرنے کے لیے ہیں۔ دونوں پاؤں چلنے کے لیے انسان کو دیے گئے۔ آنکھیں راہ دیکھنے کے لیے۔ منہ غذا کھانے کی غرض سے اور معدہ اس غذا کو ہضم کرنے کے لیے دیا گیا۔ جگر غذا کا جوہر نکالنے کے واسطے اور اعضائے تولید افزائش نسل کے لیے عطا کیے گئے وغیرہ وغیرہ۔

اب اگر تم ان تمام اعضاء، ان کی بناوٹ، کارکردگی اور جسم کے اندر ان کے مقام پر غور کرو گے تو سمجھ جاؤ گے کہ ہر عضو ایک خاص مصلحت کے ساتھ پیدا کیا گیا اور جسم کے ہر عضو کا دوسرے عضو سے ایک خاص رشتہ اور رابطہ ہے۔ یہ تمام عضو مل کر انسانی

جسم کی تشکیل کرتے ہیں اور انسان کو وہ تمام سہولتیں فراہم کرتے ہیں جس کی اسے زندگی گزارنے کے لیے ضرورت ہے۔"

نوٹ: جسمانی اعضاء اور ان کے کام

انسانی جسم کے اعضاء، جسم میں ان کے مقام اور ان کی کارکردگی کے بارے میں امامؑ نے جو کچھ فرمایا وہ اس زمانے کے انسانوں کی ذہنی سطح کو سامنے رکھ کر فرمایا اور مختصراً اتنا ہی بتایا جسے اس زمانے کا انسان کسی قدر سمجھ سکے اور اعضاء کی قدر و قیمت کا کسی قدر اندازہ لگا سکے۔

جسم کے اعضاء ان کی تعمیر اور ان کی کارکردگی کے بارے میں حقیقت (جس سے امامؑ اس وقت بھی واقف تھے) اس قدر حیران کن اور عقل کو ششدر کر دینے والی ہے کہ جدید سائنسی دور میں اس موضوع پر ہزاروں لاکھوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور بے شمار تحقیقات سامنے آ جانے کے باوجود آج کے ماہرینِ حیاتیات انسانی جسم اور اس کے اعضاء کی کارکردگی کے بارے میں یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ انہوں نے جسم کے اعضاء اور کارکردگی کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل کی ہیں۔ ابھی بہت کچھ معلوم کرنا باقی ہے۔ ہم جدید اینا ٹومی (علم الابدان) اور فزیالوجی (علم فعلیات) کی مدد سے مختصراً صرف ان اعضاء کے بارے میں عرض کریں گے جن کا تذکرہ امام علیہ السلام نے فرمایا ہے۔ پورے جسم کے بارے میں قارئین کسی قدر زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہیں تو ہماری کتاب "جسم کے عجائبات" کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے ہاتھ اللہ کی صناعی کا عظیم شاہکار

یہ دونوں ہاتھ ہمیں پیدائشی طور پر ملے ہیں، بے مانگے اور مفت ہاتھ آئے ہیں اس لیے شاید ہمیں اللہ تعالیٰ کے ان تحفوں کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہے۔ یہی ہاتھ ہمیں بعد میں ضرورت محسوس کرنے کے بعد ملتے اور قیمتاً ملتے تو شاید ہم ہاتھ دینے والے کا شکریہ ادا کرتے کرتے نہ تھکتے۔

ہمارے ہاتھ اللہ تعالیٰ کی صناعی کا عظیم نمونہ اور اس کی بے مثال ٹیکنالوجی کا عظیم شاہکار

ہیں۔ ہمارے ہاتھ ہڈیوں' جوڑوں اور انہیں سنبھالنے والے بافتوں' ڈوریوں اور پٹیوں کا مجموعہ ہیں اور دماغ کے حکم پر حیران کن خدمات سرانجام دیتے ہیں۔

دنیا میں ٹیکنالوجی کے تمام تر نمونے' زمین سے نکل کر خلاء میں سفر کرتے خلائی جہاز' تمام آلات' مشینیں' مصوری' مجسمہ سازی' ادب، موسیقی اور شاعری کے تمام شاہکار غرض انسان کی بنائی ہوئی ہر چیز ہاتھوں اور دماغ کی بہترین ورکنگ ریلیشن شپ (ہم آہنگی) ہی کے سبب وجود میں آئی ہے۔ وہی ہم آہنگی جس کا تذکرہ امام علیہ السلام نے فرمایا ہے۔

دماغ کے اندر دونوں ہاتھوں کی حرکات وسکنات کو کنٹرول کرنے اور ان کی نگرانی کرنے کے لیے دو بڑی جگہیں مخصوص ہیں، انہیں موٹر کورٹیکس کہا جاتا ہے۔ اگر آپ اپنے انگوٹھے کو ذرا سی حرکت دیتے ہیں تو اس بظاہر سادہ سی حرکت کے پیچھے ایک حیران کن نظام کام کر رہا ہوتا ہے۔ اس معمولی سی حرکت کے لیے بھی دماغ سے ہاتھ اور ہاتھ سے دماغ کے درمیان ہر سیکنڈ میں ہزاروں برقی کیمیائی پیغامات سفر کر رہے ہوتے ہیں اور بے شمار الیکٹریکل، میکینیکل اور برقی کیمیائی عمل اور ردِعمل رونما ہو رہے ہوتے ہیں۔

چالیس پینتالیس سال کے عرصے میں صرف انگلیوں کے کھلنے اور بند ہونے کا عمل کم از کم پچیس کروڑ مرتبہ دہرایا جا چکا ہوتا ہے لیکن انگلیاں خراب ہوتی ہیں نہ ان کے جوڑ۔

ایک ہاتھ کی کلائی میں آٹھ ہڈیاں پائی جاتی ہیں۔ 5 ہڈیاں پنجے میں اور 14 ہڈیاں انگلیوں کے جوڑوں میں ہوتی ہیں۔ اگر دونوں ہاتھوں کی ہڈیوں کو جمع کر لیا جائے تو یہ کل 54 ہڈیاں ہوتی ہیں۔ یعنی تمام جسم کی کل ہڈیوں کی ایک چوتھائی ہڈیاں صرف دونوں ہاتھوں میں پائی جاتی ہیں۔

ہاتھوں کی جلد میں اعصاب کا بہت بڑا نیٹ ورک پایا جاتا ہے جس کے ذریعے انسان گرمی سردی' نرمی' سختی' درد یا راحت کو محسوس کر سکتا ہے۔ انگلیوں اور ہتھیلی کی جلد خاص انداز کی ہوتی ہے۔ اگر انگلیوں کی جلد پر نظر نہ آنے والی لائنیں نہ ہوتیں تو بہت سے کام مثلاً قلم پکڑنا، سوئی اٹھانا' کار کے اسٹیئرنگ وہیل کو مضبوطی سے پکڑنا آپ کے لیے مشکل ہو جاتا۔

انگلیوں کی اہمیت اپنی جگہ لیکن اگر ہمارا انگوٹھا نہ ہوتا تو ہمارے لیے کوئی بھی چیز پکڑنا ممکن نہ رہتا۔ایسی صورت میں ہاتھ بالکل اس پلاس کی طرح ہوتا جس کا ایک بازو موجود نہ ہو۔

آپ کے دونوں ہاتھ ڈوریوں اور پٹھوں کی مدد سے دماغ کے احکامات کے مطابق حرکت کرتے ہیں۔انگلیاں، انگوٹھا اور اس کے جوڑ انھی ڈوریوں اور پٹھوں کی مدد سے کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔مثلاً اگر اس وقت یہ تحریر لکھی جارہی ہے تو بظاہر اسے ہاتھ لکھ رہا ہے لیکن ساری معلومات' جملوں کی ترتیب، ان کا املا، سب کچھ دماغ میں موجود ہے۔ دماغ ان تمام معلومات کے حروف، الفاظ، سطور اور پیراگرافوں کو ہاتھ کی مدد سے کاغذ پر منتقل کررہا ہے۔

ہاتھوں کی کچھ صلاحیتیں بڑی حیران کن ہیں۔ یہ ہاتھ نابینا افراد کے لیے آنکھیں بن جاتے ہیں۔آپ جیب میں ہاتھ ڈال کر مطلوبہ سکّے کو بغیر دیکھے پہچان لیتے ہیں۔خواتین کپڑے کو چھو کر اس کی کوالٹی کا اندازہ کرسکتی ہیں۔کسان مٹی کو ہاتھ میں لے کر اس کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا ہے۔

انگلیوں کی جلد بے حد حساس ہے۔یہاں جلد کے ہر مربع انچ کے اندر جلد کے نیچے ہزاروں اعصاب کے آخری حصے موجود ہیں۔اعصاب کا مطلب ہے اطلاعاتی مراکز جو ہر لمحے دماغ سے رابطے میں رہتے ہیں، اسے اطلاعات فراہم کرتے اور اس کے احکام پر عمل درآمد کرتے رہتے ہیں۔

پاؤں، قدرت کی ٹیکنالوجی کا عجوبہ!

انسانی جسم پر تحقیق کرنے والے ماہرینِ حیاتیات، انسانی پیروں کو قدرت کی انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی کا ایک شاہکار کہتے ہیں۔ دونوں پاؤں ایک انتہائی پُر پیچ مشین ہیں جو دماغ کے احکامات کے مطابق ہمارے لیے حیران کن کام سرانجام دیتے ہیں۔

جب آپ صرف کھڑے ہوتے ہیں۔اس وقت آپ کے ذہن میں پیروں کا کوئی تصور نہیں ہوتا لیکن اس وقت بھی یہ پاؤں دماغ کی ہدایت کے مطابق ہر لمحے آپ کے لیے حیران کن خدمات سرانجام دے رہے ہوتے ہیں۔اگر پاؤں یہ خدمات سرانجام نہ دیں یا دماغ اور پاؤں کے درمیان یہ رابطہ ایک لمحے کو بھی منقطع ہوجائے تو آدمی خالی بوری کی طرح زمین پر ڈھیر ہوجائے۔

اس وقت ہر پاؤں اپنی 26 ہڈیوں' 107 لیگا مینٹس (جھلی کی بنی ہوئی پٹیوں) اور 19 پٹھوں کے پُراسرار اور پیچیدہ عمل اور ردِ عمل کے ذریعے دماغ کو لمحہ بہ لمحہ سینکڑوں پیغامات ارسال کر رہا ہوتا ہے اور پھر اس کی جانب سے آنے والے احکامات کے مطابق ڈیڑھ سو پونڈ وزنی اور ساڑھے پانچ فٹ لمبے جسم کے توازن کو صرف سات آٹھ انچ کی مختصر سی جگہ پر سنبھالے رکھنے کے لیے ہر لمحہ ایک نئی حکمت عملی اختیار کر رہا ہوتا ہے تاکہ آپ آرام سے کھڑے رہیں۔ آپ کا توازن نہ بگڑے' آپ کسی طرف کو گر نہ جائیں۔ ایڑیوں میں موجود مواصلاتی نظام دماغ کو آپ کے ہر لمحہ بدلتے ہوئے زاویے اور وزن کے بارے میں اطلاعات فراہم کرتا رہتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ فلاں جانب وزن بڑھ رہا ہے' جسم فلاں زاویے پر مڑ رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ دماغ ان معلومات کی روشنی میں ہمارا توازن برقرار رکھنے کے لیے پیروں کو احکامات جاری کرتا رہتا ہے۔ مثلاً فلاں پٹھے کو کھینچو، فلاں پٹھے کو ڈھیلا چھوڑ دو۔

توانائی کی فراہمی

ہر کام کی طرح کھڑے ہونے کے لیے بھی آپ کو خاص مقدار میں توانائی درکار ہوتی ہے۔ آپ کو مطلوب توانائی کا اندازہ کر کے پیروں کا مواصلاتی نظام دماغ میں موجود ایک مقام (ہائی پوتھیلی مس) کو مطلع کرتا ہے۔ یہ ہائی پوتھیلی مس، ماسٹر گلینڈ یعنی پیچوٹری گلینڈ کو ان ضروریات سے آگاہ کرتا ہے۔

ماسٹر گلینڈ خون میں ایک ہارمون شامل کرنے لگتا ہے، جو براہِ راست آپ کی گردن پر موجود جسم کے توانائی گھر (تھائی رائیڈ گلینڈ) کو موصول ہوتا ہے۔ یہ گلینڈ (غدود) اس کے ردِ عمل میں اپنا ایک ہارمون خون میں شامل کر دیتا ہے۔ یہ ہارمون جسم کے سو ٹریلین خلیوں میں موجود توانائی گھروں (MITOCONDRIA) کو آن کر دیتا ہے (ہر خلیے میں ایک ہزار توانائی گھر پائے جاتے ہیں)۔ اس طرح پیروں کی ضرورت کے مطابق توانائی سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں فراہم ہو جاتی ہے۔

ہم چلتے ہیں، گھومتے پھرتے ہیں تو ہم کبھی اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو اس کا بنایا ہوا جسمانی نظام ہمیں زندگی بھر ہر لمحے فراہم کرتا رہتا ہے۔

کیا یہ اعضاء خود بہ خود بن جاتے ہیں!

امام علیہ السلام کی باتیں سن کر مفضل ابن عمرؓ نے عرض کی:

"آقا! کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سب باتیں طبیعت (نیچر) کے سبب پیدا ہوتی ہیں یعنی جس مخلوق کو جس طرح کے اعضاء کی ضرورت ہوتی ہے وہ خود بہ خود بن جاتے ہیں۔"

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"مفضل! ایسے لوگوں سے سوال کیا جائے کہ کیا طبیعت (نیچر) جو اس قدر عظیم اور با مصلحت کام اس قدر باریک بینی سے سرانجام دیتی ہے تو کیا وہ علم، ارادہ اور قدرت بھی رکھتی ہے یا وہ بے شعور و بے ادراک ہے اور اس میں قوت ہے نہ علم؟ اب اگر وہ کہتے ہیں اس میں علم ارادہ اور قدرت ہے تو پھر انہیں خلق کرنے والی ذات (اللہ) کو ماننے سے کیا چیز روکتی ہے؟

اور اگر یہ اللہ کا انکار کرنے والے کہتے ہیں کہ طبیعت (یعنی نیچر) بے علم، بے ارادہ و بے قدرت ہے اور بغیر کسی علم و قدرت کے چیزوں کو بنا دیتی ہے تو یہ امر محال ہے کہ بے عقل، بے ارادہ، بے قدرت شئے اس قدر علم و حکمت، مصلحت و باریک بینی کے ساتھ کسی صاحب شعور و ادراک شئے کی تخلیق کرے"۔

نیچر اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ایک نظام ہے

''مفضل دیکھو! اصل بات یہ ہے کہ یہ تمام مخلوقات اللہ رب کریم کی پیدا کردہ ہیں اور جسے یہ لوگ طبیعت (نیچر) کہتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ایک نظام ہے جسے اس نے (اپنی حکمت سے) مخلوقات میں جاری کر دیا ہے۔''

نوٹ: فطری انتخاب کا نظریہ

امام علیہ السلام کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ کسی چڑیا یا تتلی میں یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ ماحول اور ضرورت کے مطابق اپنے ذاتی ارادے سے خود اپنی چونچ چھوٹی یا بڑی کر سکے یا کوئی تتلی دشمن سے بچنے کے لیے خود اپنے رنگ کو تبدیل کر کے پتوں کی ہم رنگ ہو جائے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ایک نظام ہے جو چڑیا یا تتلی یا دوسری مخلوقات کی بقاء کے لیے ان میں تبدیلیاں پیدا کرتا ہے۔

مشہور سائنسدان چارلس ڈارون نے اٹھارویں صدی عیسوی میں مشہور نظریہ ارتقاء پیش کیا اور بتایا کہ تمام ذی حیات اپنے ماحول، موسم اور ضروریات کے مطابق اپنے اندر تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں۔ ہم اپنے قارئین کو اس طرف متوجہ کرنا چاہیں گے۔

دیکھئے! چارلس ڈارون نے نیچرل سلیکشن (فطری انتخاب) کے حوالے سے جو نظریہ اٹھارویں صدی عیسوی میں پیش کیا، وہ خود اس کا نظریہ یا تحقیق نہیں تھی بلکہ اس نے یہ نظریہ دراصل اسلام کے علمی دسترخوان سے حاصل کیا تھا جس کا ثبوت درجِ بالا سوال ہے جو مفضل ابن عمرؓ نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے کیا اور امامؑ نے اس کا تفصیلی جواب دیا۔ دوسری صدی ہجری (یعنی آٹھویں صدی عیسوی) میں ہونے والی یہ علمی گفتگو اس وقت ہوئی جب کہ چارلس ڈارون کے پیدا ہونے میں ابھی صدیوں کا فاصلہ تھا۔

اس باب میں ہم نے امامؑ کے صرف دو جملوں کی سرسری وضاحت پیش کی ہے۔ آیندہ باب میں آپ نظامِ ہضم کے اعضا کے بارے میں امامؑ کے ارشادات اور ان کی کسی قدر تفصیل جان سکیں گے۔

باب: 6

غذا کس طرح خوشگوار ہوتی ہے؟

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے شاگرد مفضل ابن عمرؓ کو غذا کھانے، اس کے ہضم ہونے اور جزو بدن بننے کے پُر اسرار و پیچیدہ عمل کی طرف متوجہ فرمایا:

> "مفضل! ذرا اس بات پر غور کرو کہ کس طرح انسان غذا کو استعمال کرتا ہے؟ یہ غذا کس طرح اس کے لئے خوشگوار ہوتی ہے؟ کس طرح اور کن مراحل سے گزر کر اس کے جسم کے ایک ایک حصے تک پہنچتی ہے اور کس طرح اس غذا کا جوہر اس کے جسم کا حصہ بن جاتا ہے؟ اس سارے عمل کے لیے پروردگار نے کس قدر عظیم الشان انتظامات کئے ہیں؟ اس میں اللہ تعالیٰ کی کس قدر حکمتیں اور تدابیر ہیں؟"

نوٹ: غذا کن مراحل سے گزر کر انسانی جسم کا حصہ بنتی ہے؟

مثلاً آپ بکری کا گوشت کھاتے ہیں تو یہ گوشت کچھ ہی دیر کے بعد انسان کا گوشت کس طرح بن جاتا ہے؟ وٹامن اے جو روٹی میں موجود ہوتی ہے کس طرح آنکھوں کو اس قابل بناتی ہے کہ انسان نیم تاریکی میں دیکھ سکے؟ کیا مادے (Matter) یا فطرت (Nature) میں یہ صلاحیت ہوسکتی ہے کہ اس قدر حیران کن اعضاء بنائے اور غذا کو جزو بدن بنانے کے لئے اس قدر پُر پیچ اور بے خطا نظام تیار کرے؟

آیئے میڈیکل سائنس اور علم فعلیات کی مدد سے ایک سرسری سی نظر ڈالتے ہیں کہ جو غذا ہم

کھاتے ہیں اس کے لئے جسم کے کون کون سے اعضاء استعمال ہوتے ہیں اور کس طرح روٹی، گوشت، دودھ، پھلوں اور سبزیوں پر مشتمل یہ غذا آخرکار ہمارے جسم کا حصہ بن جاتی ہے اور غذا کا فالتو حصہ اور اس کے استعمال کے دوران پیدا ہونے والے زہریلے مادے کس طرح اور کن ذرائع سے جسم سے خارج ہوتے ہیں۔

غذا کا مزے دار ہونا ضروری ہے

غذا کو استعمال کرنے میں سب سے پہلے تو ضروری ہے انسان کو بھوک محسوس ہو اور غذا کھا کر اسے مزہ آئے۔ اس مزے کو محسوس کرنے کے لئے ذائقوں کو محسوس کرنے والے مائکرواسکوپک اُبھار تالو، زبان اور حلق میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ اُبھار ذائقے کو اس وقت تک محسوس نہیں کرتے جب تک غذا لعابِ دہن (سلائیوا) کے ساتھ دانتوں اور داڑھوں کے ذریعے گرینڈ ہونے یا پسنے کے بعد کسی حد تک نیم سیال پیسٹ میں تبدیل نہ ہو جائے۔

اسی لئے کھانے کی کوئی بھی چیز آپ منہ میں رکھیں تو زبان اسے دانتوں اور پھر داڑھوں کے حوالے کر دیتی ہے۔ دانت اور داڑھیں اسے پیس کر پیسٹ کی شکل میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد زبان اس نوالے کو اٹھا کر لہراتی ہے اور اس عمل کے ذریعے نوالے کو حلق میں لے جاتی ہے۔

نوالہ نگلنے کا عمل

حلق کے نیچے غذا اور سانس کی دو نالیاں ایک دوسرے کے قریب موجود ہیں۔ خطرہ موجود ہوتا ہے کہ یہ نوالہ کہیں اچانک آنے والی چھینک یا قہقہے کی وجہ سے سانس کی نالی میں نہ چلا جائے۔ اس خطرے کے تدارک کے لئے اللہ نے حلق کے اندر ایک ڈھکن بنایا ہے۔ اس ڈھکن کو اردو میں حلق کا کوا کہا جاتا ہے۔

غذا کا نوالہ جب حلق میں کھلنے والے ناک کے سوراخوں کے نیچے سے گزر کر غذا کی طرف جا رہا ہوتا ہے تو حلق کا کوا سانس لینے کے ان سوراخوں کو بند کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ اگر غذا سانس

کی نالی میں چلی جائے تو اُچھو ہوسکتا ہے حتیٰ کہ اچانک موت تک واقع ہوسکتی ہے۔ منہ اور حلق ہر نوالے اور پانی کے ہر گھونٹ کو اسی نفاست کے ساتھ غذا کی نالی تک پہنچاتا رہتا ہے۔

غذا کا سفر

یہ غذا کئی مرحلوں سے گزر کر معدے میں پہنچتی ہے تو معدے کی اندرونی تہہ جو تولیے کی طرح ہوتی ہے فوراً ہی دماغ کے حکم پر کچھ تیزابی مادے پیدا کرنے لگتی ہے اور معدہ اس نیم سیال کو ان تیزابی مادوں کے ساتھ ملا کر مزید باریک پیسٹ میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ذرا ہی دیر بعد معدہ اس پیسٹ کو چھوٹی آنت کے اندر داخل کرنا شروع کر دیتا ہے۔ معدہ صرف اتنے ہی غذائی مواد کو چھوٹی آنت میں داخل کرتا ہے جس قدر غذا پر چھوٹی آنت ایک وقت میں کام کر سکے۔

یہ غذا جب چھوٹی آنت میں داخل ہوتی ہے تو تیزابی مادوں سے بھری ہوتی ہے۔ اگر یہ زیادہ دیر یہاں یونہی پڑی رہے تو یہ تیزابی مادے چھوٹی آنت میں السر (زخم) پیدا کر سکتے ہیں۔ اسی لئے جیسے ہی یہ غذا یہاں پہنچتی ہے تو چھوٹی آنت فوراً ہی ایک رطوبت خارج کرتی ہے۔ یہ رطوبت خون میں شامل ہوکر براہِ راست آپ کے لبلبے تک پہنچتی ہے۔

لبلبہ اس پیغام کو سمجھ لیتا ہے اور فوراً ہی ایک نمکین رطوبت پیدا کرنے لگتا ہے۔ یہ نمکین رطوبت چھوٹی آنت میں آکر گرنے لگتی ہے اور یہاں موجود غذا میں شامل تیزابی مادوں کے اثرات کو نیوٹرل (بے اثر) کر دیتی ہے۔

اسی طرح غذا کو قابلِ ہضم بنانے کے لئے ایک اور کیمیائی مادہ صفرا (Bile) جگر میں تیار ہوتا ہے اور چھوٹی آنت میں آکر یہاں غذا میں موجود چکنائی کے بڑے ذرات کو چھوٹے ذرات میں تبدیل کر دیتا ہے۔

(جسم کے اعضاء کے درمیان ہم آہنگی کے بارے میں امام علیہ السلام نے جو فرمایا اسے ذہن میں رکھیے اور دیکھیے کہ آج سائنس اس قول کی تفسیر کس طرح بیان کر رہی ہے)

چھوٹی آنت میں اس کیمیائی عمل سے گزرنے کے بعد یہ غذائی مواد بڑی آنت میں پہنچتا

ہے۔چھوٹی آنت سے بڑی آنت کے آخری سرے تک آنتوں کی لمبائی 26 فٹ کے قریب ہوتی ہے۔اس پورے راستے سے گزرتے وقت غذا کے ہاضمے اور اسے جزو بدن بنانے کے لئے مختلف مرحلوں میں کام جاری رہتا ہے۔

آخری مرحلے میں بڑی آنت اس غذائی پیسٹ سے تمام پانی اپنے اندر جذب کر لیتی ہے جہاں سے یہ پانی دوبارہ دورانِ خون میں شامل ہو جاتا ہے۔جب تمام پانی نکل جاتا ہے تو غذائی پیسٹ میں موجود فاضل مادے نسبتاً ٹھوس حالت میں آکر بڑی آنت کے آخری حصے میں جمع ہونے لگتے ہیں اور بالآخر مناسب وقت پر جسم سے باہر نکل جاتے ہیں۔

اس سے پہلے بڑی آنت کی اندرونی تہہ اپنے مخصوص ابھاروں کی مدد سے غذا میں موجود جزو بدن بننے والے غذائی اجزاء کو اپنے اندر جذب کر کے انہیں پورے جسم میں پہنچا دیتی ہے۔ لحمیات (پروٹینز) اور نشاستے دورانِ خون میں شامل ہو کر جسم کے ایک ایک حصے تک پہنچتے ہیں اور چکنائی ایک اور نظام ''لمف سسٹم'' کے ذریعے پورے جسم کو فراہم کی جاتی ہے۔

(حوالہ از: جسم کے عجائبات)

بھوک لگنا اللہ کا ایک احسان

بھوک لگنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔یہ اللہ کے عظیم احسانات میں سے ایک ہے۔جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہمارے جسم کے اندر حیران کن انتظامات کئے ہیں۔بھوک کی قدر و قیمت کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں بھوک نہ لگنے کا تجربہ ہو چکا ہو۔

بھوک لگنے سے پہلے، اس کے دوران اور بھوک ختم ہونے کے بعد ہمارے جسم میں بے شمار پُراسرار و پیچیدہ انتظامات کئے جاتے ہیں۔آپ کو کھانا کھلانے، اسے ہضم کرنے اور اسے جزو بدن بنانے کے اس عمل میں کتنے اعضاء، صلاحیتیں، غدود، کیمیائی مادے، کمیونی کیشن کے کس قدر عظیم الشان سلسلے اور جسم کے کس قدر خلیے اپنی خدمات پیش کرتے ہیں، آپ اس کا تصور کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے۔

بھوک لگنے سے ذرا پہلے جسم کے اندر موجود مواصلاتی نظام جسم کے مختلف حصوں میں توانائی کے کم ہونے کے بارے میں معلومات ہزاروں برقی کیمیائی سگنلز کے ذریعے دماغ کے ایک مخصوص حصے کو فراہم کرنا شروع کر دیتا ہے۔ دماغ کے اس حصے کو ہائی پوتھیلی مس کہا جاتا ہے۔

مثلاً برقی سگنلز کی شکل میں دماغ کے اس حصے تک جسم کے مختلف مقامات سے اطلاعات آتی ہیں کہ خون میں شوگر کی مقدار گر رہی ہے۔ دوسری طرف سے اطلاع آتی ہے کہ توانائی کے بحران کے سبب تھکن اور کمزوری کے ہلکے ہلکے اثرات پٹھوں پر محسوس ہو رہے ہیں۔

دماغ کا یہ مخصوص حصہ ان تمام معلومات کا تجزیہ کرتا ہے اور دماغ میں موجود ایک غدود (پیچوٹری گلینڈ) سے رابطے میں رہتے ہوئے پورے جسم میں پھیلے ہوئے غدود اور اعضاء کو اپنے ہارمونز کی مدد سے ہدایات فراہم کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ان ہارمونز کے ملتے ہی منہ، زبان، حلق اور معدے تک جانے والی غذائی نالی میں موجود ہاضمے میں مدد فراہم کرنے والے غدود اپنی پیداوار میں اضافہ کر دیتے ہیں۔

یہ رطوبت جسے سلائیوا (Saliva) کہا جاتا ہے، منہ سے لے کر حلق اور غذائی نالی تک پھیل جاتی ہے۔ زبان پر ذائقہ محسوس کرنے والے ابھاروں کی حساسیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اس مرحلے پر گرم روٹی کی مہک یا سالن کی ہلکی سی خوشبو سے بھی ہمارے منہ میں پانی بھر آتا ہے اور ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اب بھوک ناقابل برداشت ہو رہی ہے۔

دماغ کے اس مخصوص حصے (ہائی پوتھیلی مس) کے دو مقامات سے کھانے پینے کے تمام معاملات کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔ ان میں سے اگر ایک کسی سبب سے کام کرنا چھوڑ دے تو ہم کھاتے کھاتے تھک جائیں، پیٹ پھٹنے لگے، اس کے باوجود ہماری بھوک ختم نہیں ہو گی اور ہم مزید کھاتے چلے جائیں گے۔

دوسرے حصے میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو ہمیں بھوک ہی نہیں لگے گی۔ زبان، منہ، حلق اور نظامِ ہضم کے دوسرے مقامات پر رطوبت پیدا نہیں ہو گی۔ ایسی صورت میں زبردستی کھلایا بھی

جائے تو ایک نوالہ بھی حلق میں اتارنا بے حد ناگوار کام ہوگا۔

(حوالہ از: جسم کے عجائبات)

جسم کا نظام، خود بہ خود نہیں بن گیا

امام جعفر صادق علیہ السلام نے جسم کے اعضاء، ان کی ضرورت واہمیت اور ان کی کارکردگی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے مفضل ابن عمرؓ سے فرمایا:

> ''ان اعضاء کی موجودگی اور ان کے افعال ثابت کرتے ہیں
> کہ یہ سارا جسمانی نظام کسی صاحبِ علم و حکمت ذات کا پیدا کیا ہوا
> ہے۔ جسم کے اعضاء اور ان کی تمام تر کارکردگی سب کچھ اس نظام
> کے تابع ہے جسے اللہ تعالیٰ نے جسم کے اندر پیدا کیا ہے۔''

باب: 7

غذااور خون کی نالیاں

ہمارا ایمان ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام جسم انسانی کے بارے میں ان تمام حقائق سے آگاہ تھے جنہیں آج میڈیکل سائنس بیان کر رہی ہے یا ان پر مزید تحقیق میں مصروف ہے۔ لیکن آج سے بارہ تیرہ سو سال پہلے ان حقائق اور تفصیلات کو کسی شخص سے مختصراً ہی بیان کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے کہ اس دور کا انسانی ذہن ان حقائق کی تفصیل کو سمجھنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

اب ہم اس علمی محفل میں واپس چلتے ہیں جہاں امام جعفر صادقؑ اپنے شاگرد کو اثباتِ وجودِ خدا کے لازوال دلائل سے فیض یاب کر رہے ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل بن عمرؓ سے فرمایا:

"دیکھو! کھانا یا غذا جب معدے میں پہنچ جاتی ہے تو معدہ اسے پکاتا ہے (اس کی کسی قدر تفصیل آپ گزشتہ باب میں ملاحظہ کر چکے ہیں)۔ معدہ اس غذا کو قابل ہضم بنا کر (آنتوں کے راستے سے) جگر کی طرف روانہ کر دیتا ہے۔ معدہ غذا کو صاف کرنے کے لیے بنایا گیا ہے (معدہ اپنے تیزابی مادوں کے ذریعے غذا میں موجود تمام جراثیم کو ختم کر دیتا ہے) پھر جگر اس غذا سے حاصل شدہ لب لباب (غذا کے جوہر) کو لے لیتا ہے۔

پھر یہ نہایت باریک حکمت سے (صاف شدہ' حیاتیاتی اجزا سے بھرپور) خون بن جاتا ہے اور ان نالیوں (Artries) کے

ذریعے سارے جسم میں پہنچ جاتا ہے جو اس کام کے لیے بنائی گئی
ہیں۔ جیسے (زراعت کے لیے) پانی کی نالیاں بنائی جاتی ہیں تاکہ
پانی تمام زمین تک پہنچ جائے۔ غذا میں موجود فاضل مادے،
گندی چیزیں (اور زہریلے مادے) ان مقامات کی طرف چلی
جاتی ہیں جو مقامات ان فاضل مادوں کے جسم سے اخراج کے
لیے بنائے گئے ہیں"۔

نوٹ: جگر کا کردار

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنی بات کو بہت مختصر کر کے بیان کیا ہے۔ اسی لیے آپؑ نے مختصراً یہ فرمایا کہ جگر (Liver) غذا کے جوہر کو لے لیتا ہے پھر یہ نہایت باریک حکمت سے خون بن جاتا ہے۔ اس فرمان کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ جگر ہی وہ عضو ہے جو جسم میں خون بننے یا اسے صاف کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جگر خون بناتا ہے البتہ خون کو زندگی بخش بنانے میں جگر ایک بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ خون بنانے میں مرکزی کردار ہڈیوں کے گودے کا ہوتا ہے آیئے ایک نظر ڈالتے ہیں انسانی جگر کی کارکردگی پر.........

جگر (Liver) کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ ہماری زندگی اور صحت کے لیے پانچ سو سے زیادہ ایسی خدمات سرانجام دیتا ہے جن میں سے اگر چند خدمات جگر سرانجام دینا بند کر دے تو انسان کو اپنی وصیت تیار کر لینا چاہیے۔

اپنی بناوٹ اور پیچیدہ کارکردگی کی وجہ سے جگر کو دماغ کے سوا جسم کے تمام اعضاء پر برتری حاصل ہے۔ جگر ایک ایسا کیمیکل پلانٹ ہے جو اپنے اندر آنے والے خون میں شامل مہلک کیمیائی اجزاء کو ایک حیران کن عمل سے گزار کر انہیں جسم کے لئے قابلِ قبول بناتا ہے۔ یہ خون پہلے جگر میں جانے کی بجائے اگر دل میں چلا جائے تو منٹوں میں انسان کی موت واقع ہو سکتی ہے۔

وہ کیمیائی مادہ جس کے سبب چوٹ لگنے کے بعد خون جم جاتا ہے' اس کے اجزاء خون میں الگ الگ سفر کر رہے ہوتے ہیں۔ زخم لگتے ہی جگر دماغ کے حکم پر خون میں موجود ان اجزاء کو ایک جگہ جمع کر کے ایسا کیمیائی مادہ بناتا ہے جس کے سبب خون میں جمنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ضرورت ختم ہونے کے بعد یہ اجزاء الگ الگ ہو کر خون میں سفر کرنے لگتے ہیں۔

بیماریوں کا مقابلہ کرنے والے اجزاء جنہیں اینٹی باڈیز کہا جاتا ہے، انہیں بھی وقتِ ضرورت جگر ہی تیار کر کے خون میں شامل کرتا ہے۔ خون کے مردہ خلیوں سے خون کے نئے خلیے بنانا بھی جگر ہی کی ذمے داری ہے۔ روزانہ کی ضرورت کا صفرا (BILE) جو چربی کو ہضم کرنے میں مدد فراہم کرتی ہے، اسے جگر ہی تیار کرتا ہے۔

جسم کے اندر نمکیات کا توازن برقرار رکھنا اور توانائی کی پیداوار کے عمل میں بننے والے زہریلے مادہ لیک ٹک ایسڈ (Lactic Acid) کو ایک پُر پیچ عمل سے گزار کر اسے گلوکوز میں تبدیل کرنا بھی جگر ہی کی ذمہ داری ہے۔ انسان کو زندہ، صحت مند اور متحرک رکھنے کے لیے کم و بیش ایک ہزار خامرے (Enzymes) تیار کرنا بھی جگر ہی کا کام ہے۔

خون کی نالیاں اور فاسد مادوں کا اخراج

عام آدمی خون کو سرخ رنگ کا ایک سیال سمجھتا ہے جو اس کے جسم میں موجود ہے اور زخم لگنے کی صورت میں اسے نظر آتا ہے۔ کوئی عام آدمی اندازہ ہی نہیں کر سکتا کہ یہ سیال مادہ کیا ہے' کن اجزاء سے کس طرح بنا ہے اور کس طرح ہر انسان کو ایک منٹ میں 72 مرتبہ غذائی اجزاء کی فراہمی اور فاسد زہریلے مادوں کے جسم سے اخراج کی خدمات فراہم کرتا ہے۔

خون کے سرخ خلیوں کی تعداد کم و بیش 25 ارب ہوتی ہے۔ یہ 25 ارب سرخ خلیے جس سیال مادے میں سفر کرتے ہیں اسے پلازما (Plasma) کہا جاتا ہے۔ خون کے سرخ خلیے ہمارے پھیپڑوں میں جا کر تازہ آکسیجن اپنے اندر جذب کرتے ہیں اور استعمال شدہ آکسیجن سے پیدا ہونے والی زہریلی گیس کاربن ڈائی آکسائیڈ کو پھیپھڑوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔

پھیپھڑے اس زہریلی گیس کو سانس کے ذریعے جسم سے خارج کرتے رہتے ہیں۔ خون کا پلازما غذائی اجزاء کو جسم کے ایک ایک خلیے تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔

رگوں میں دوڑنے والا خون

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"مفضل! کیا تم نے کبھی اپنے جسم کے اندر بہنے والے خون پر غور کیا؟ اور یہ سوچا کہ اس خون کو رگوں میں کس طرح بند رکھا گیا جس طرح پانی (جیسے آبِ حیات) کو کسی برتن میں رکھا جاتا ہے۔ رگوں میں بند رہنے سے یہ خون محفوظ رہتا ہے اور جسم میں ادھر ادھر (بے وجہ) بہہ نہیں پاتا۔"

نوٹ: حیران کن سائنسی انکشافات

غذائی اجزاء کا دورانِ خون کے ذریعے اعضاء تک پہنچنا اور فاضل مادّوں کا خون سے نکل کر جسم سے خارج ہونے والے مقامات تک پہنچنا۔ خون کا خون کی نالیوں (یعنی شریانوں اور وریدوں) میں بند ہونا...... یہ سب ایسے حیران کن انکشافات ہیں جن کے بارے میں جزیرہ عرب ہی نہیں، یونان کے علمی معاشرے میں بھی کسی کو حتمی طور پر کچھ معلوم نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ خون ہمارے جسم میں کسی لہر کی طرح سفر کرتا ہے۔

دورانِ خون کے جسم میں سفر کرنے کے نظام یعنی (Cirulatory System) کے بارے میں حتمی ثبوت 1628 صدی عیسوی میں برطانیہ کے ایک ڈاکٹر ولیم ہاروے (William Harvey) نے فراہم کیے کہ خون، شریانوں اور وریدوں کے ذریعے کس طرح پورے جسم میں سفر کرتا ہے۔ غذائی اجزا اور فاسد مادّوں کے جگر کے ذریعے الگ الگ ہو کر جسم کے خلیوں اور

مخصوص اعضاء تک پہنچنے کے بارے میں ماہرین حیاتیات کو 1930 عیسوی میں الیکٹران خردبین کی ایجاد کے بعد معلومات حاصل ہونا شروع ہوئیں۔(حوالہ از: How Body Work)

امام جعفر صادق علیہ السلام نے ان تمام سائنسی حقائق کو مغرب کی سائنسی ترقی سے صدیوں پہلے کم وبیش سن دو ہجری یعنی آٹھویں صدی عیسوی میں بیان فرمایا جن کے بارے میں آپؑ سے صدیوں پہلے اور صدیوں بعد بھی اس کرہ ارض پر کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

عام انسان خون کے ذریعے غذا کی فراہمی

جسم کا خون جسم کے اندر خون کی جن نالیوں (شریانوں اور وریدوں) کے ذریعے سفر کرتا ہے، ان تمام شریانوں اور وریدوں کو جسم سے نکال کر اگر ایک لائن میں رکھا جائے تو ان کی مجموعی لمبائی کم وبیش 75 ہزار میل بنتی ہے۔ یعنی انھیں کرہ ارض کے گرد تین مرتبہ لپیٹا جا سکتا ہے۔

ہمارا دل ایک منٹ میں 72 مرتبہ دھڑکتا ہے اور ہر مرتبہ خون کی ایک خاص مقدار غذائی اجزاء کی ایک خاص مقدار لے کر دل سے جسم کی طرف سفر شروع کر دیتی ہے۔ خون کے سرخ خلیوں کی عمر 120 دن ہوتی ہے۔ آپ جتنی دیر میں پلک جھپکتے ہیں اتنی دیر میں خون کے کم وبیش 12 لاکھ خلیے اپنی زندگی پوری کر کے مر جاتے ہیں لیکن اسی عرصے میں ہڈیوں کا گودا (Bone Marrow) خون کے اتنے ہی نئے سرخ خلیے دورانِ خون میں شامل کرتا رہتا ہے۔ دورانِ خون جسم کے ایک ایک عضو ایک ایک خلیے تک اس کی ضرورت کی اشیاء پہنچاتا ہے لیکن جسم سے واپسی کے سفر میں یہ خون زہریلے اجزاء سے آلودہ ہو چکا ہوتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح کھیتوں کو دیا جانے والا پانی مختلف غلاضتوں کے ملنے سے گندا ہو جاتا ہے۔

آلودہ خون کی صفائی

اس خون کی صفائی جسم سے دل کی طرف واپسی میں ہوتی ہے۔ ہمارے گردے اس خون کو مسلسل صاف کرتے رہتے ہیں۔ اپنے گردوں کو آپ ڈائی لائی سز مشین سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارا خون ان گردوں کے ذریعے ایک گھنٹے میں دو مرتبہ صاف کیا جاتا ہے۔ گردوں میں ایسی باریک چھلنیاں

موجود ہیں جو خون سے صرف فاسد اور غیر ضروری مادوں کو صاف کر کے اسے مثانے کی طرف بھیجتی رہتی ہیں۔ یہ فاضل اور زہریلے مادے مثانے میں جمع ہوتے رہتے ہیں اور آخر کار جسم سے خارج کر دیے جاتے ہیں۔

اعضاء اور نکاسی کا نظام

امام علیہ السلام نے فرمایا:

تو مفضل! دیکھو اور غور کرو کہ جسم انسانی کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی شان خلاقیت کی کیسی کیسی عظیم نشانیاں موجود ہیں۔ دیکھو کہ یہ تمام اعضاء کس طرح جسم میں اپنے لیے انتہائی مناسب مقامات پر تخلیق کیے گئے۔ یہ ظروف (آنتیں، گردے اور مثانہ) کس طرح تخلیق پائے کہ یہ اپنے اندر فضلے (فاسد مادوں) کو جمع کریں۔ انہیں جسم کے باقی حصوں میں نہ پھیلنے دیں۔ اگر یہ فضلے جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل جائیں تو جسم میں بیماریاں پیدا ہو جائیں گی۔

تو کیا ایک بے جان مادے اور بے شعور طبیعت (Nature) کے لیے یہ ممکن تھا کہ جسم انسانی کو اس باریک بینی اور حکمت و مصلحت کے ساتھ تخلیق کرے۔

پس مبارک ہے وہ ذات جس نے اس قدر اچھے انداز اور محکم تدبیر کے ساتھ ان اعضاء کو پیدا کیا۔ اس کے لیے وہ حمد و

ثناء ہے جس کا وہ مستحق ہے اور جس کا وہ سزاوار ہے۔ الحمدللہ رب العالمین۔

مفضل بن عمرؓ نے بھی بے ساختہ "الحمدللہ رب العالمین" کہا اور عرض کی:

"آقا! اب آپ مجھے جسم کی نشوونما کے بارے میں بتایئے۔ یہ نشوونما جسم کے مکمل ہونے تک کس طرح جاری رہتی ہے۔ اس کے بارے میں فرمایئے!"

....

جسم کی نشوونما کے راز کو ماہرین حیاتیات نے صحیح معنوں میں انیسویں صدی کے نصف آخر میں DNA کی دریافت کے بعد سمجھا۔ جبکہ امام علیہ السلام نے اس حوالہ سے اس سے ہزار سال پہلے جو کچھ فرمایا، وہ حیران کن ہے۔ اس حوالے سے تفصیلات اگلے باب میں ملاحظہ فرمائیں۔

باب: 8

جسم کی نشوونما

اس علمی نشست میں مفضل بن عمرؓ نے امام علیہ السلام سے ایک سوال کیا تھا۔ انہوں نے پوچھا تھا کہ آپ مجھے انسانی جسم کے نشوونما کے بارے میں بتایئے کہ جسم کس طرح بڑھتا رہتا ہے اور جسم کے مکمل ہونے تک یہ عمل کس طرح جاری رہتا ہے۔؟

امام علیہ السلام نے مفضل بن عمرؓ سے اس بارے میں جو کچھ فرمایا اس کے بارے میں اس سے پہلے اس وقت کے علمی مراکز مثلاً یونان، ہندوستان، مصر اور چین کے فلسفی، حکیم اور دانشور بھی حتمی طور پر کچھ نہیں جانتے تھے اور جو کچھ جانتے تھے وہ بھی بیشتر ناقص معلومات پر مبنی تھا۔ مغرب کے سائنس دانوں نے بھی امام علیہ السلام کے دور سے کم وبیش ہزار سال کے بعد جسم انسانی کے ان اسرار ورموز کو سمجھنا شروع کیا۔

جسم کی تعمیر

امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل بن عمرؓ کے سوال کے جواب میں فرمایا:

دیکھو مفضل! ”انسانی جسم کی نشوونما کے آغاز کا پہلا مرحلہ تو رحم مادر میں مکمل ہوتا ہے (یہ بارآور خلیہ رحمِ مادر کی دیوار سے چپکتا ہے جب مرد کا تولیدی خلیہ عورت کے تولیدی خلیے سے ملتا ہے)۔
اس مرحلے میں نہ انسانی آنکھ اسے دیکھ سکتی ہے اور نہ کسی کا ہاتھ اس تک پہنچ سکتا ہے اور پھر اس کی ”تدبیر“ ہوتی رہتی ہے۔
یہاں تک کہ اس کے تمام اعضاء و جوارح جو ترکیبِ بدن میں شامل ہیں، تیار ہو جاتے ہیں۔ مثلاً دل، جگر، معدہ، ہڈیاں،

گوشت، چربی، مغز، رگیں، پٹھے وغیرہ۔ جب یہ سب کارکن اعضاء تیار ہو جاتے ہیں تو انسان اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے۔

"پھر تم دیکھتے ہی ہو کہ پیدا ہونے کے بعد اس کے اعضاء کس طرح خود بہ خود ایک نظام کے تحت نشو ونما حاصل کرتے رہتے ہیں۔ غور کرو کہ اعضاء تو بڑھتے رہتے ہیں لیکن اس کا جسم اپنی خاص ہیئت پر برقرار رہتا ہے۔ اس کے بدن میں کوئی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوتی۔ نہ کوئی چیز اس میں باہر سے جوڑی جاتی ہے اور نہ نکالی جاتی ہے جس سے یہ سمجھا جائے کہ جسم میں کہیں کوئی پیوند لگایا گیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی پختگی تک پہنچ جاتا ہے، چاہے اس کی عمر دراز ہو یا وہ اپنی مدتِ عمر اس سے پہلے ہی پوری کر لے۔

تو کیا یہ انسانی جسم کی حیران کن نشو ونما اللہ کا انکار کرنے والوں کو سمجھانے کے لیے کافی نہیں ہے؟ کیا بے حس اور بے روح مادّے یا طبیعت (یعنی نیچر) میں یہ صلاحیت ہو سکتی ہے کہ وہ انسان کی تخلیق کے لیے اس قدر باریک ترکیب (منصوبے) اور حکمت سے کام کر سکے؟"

نوٹ: تدبیر سے کیا مراد ہے؟

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: "پھر اس کی تدبیر ہوتی رہتی ہے"۔ اس ایک لفظ "تدبیر" کی تشریح کرنا علمائے حیاتیات کا کام ہے۔ اس ایک لفظ کی سائنسی تفسیر کے لیے ہزاروں

کتابیں تحریر کی جا چکی ہیں لیکن اس کے باوجود ماہرینِ حیاتیات یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ وہ سب کچھ جان چکے ہیں۔ ہم اس لفظ تدبیر کی مختصر تشریح بیان کریں گے۔

ماہرینِ حیاتیات 19 ویں صدی کے نصف آخر تک اس تجسس کا شکار رہے کہ یہ انسانی جسم رحمِ مادر میں آخر کس طرح تشکیل پاتا ہے؟ کس طرح ایک ننھا سا خلیہ ایک جیتے جاگتے انسان میں تبدیل ہو جاتا ہے؟ سارا جسم اور اس کے اعضاء مثلاً ہاتھ پیر، ہڈیاں، کھوپڑی، آنکھ، کان، ناک، یہ سب اعضاء ایک مرحلے پر آنے کے بعد بڑھنا کیوں رُک جاتے ہیں۔ سر کے بال بڑھتے رہتے ہیں لیکن پلکوں کے بال ایک مرحلے پر ٹھہر کیوں جاتے ہیں؟ بچوں کی شکل اپنے والدین سے کیوں مشابہہ ہوتی ہے؟ بالوں اور آنکھوں کا رنگ ہر شخص میں الگ الگ کیوں ہوتا ہے؟

یہ اور اسی طرح کے ہزاروں سوال تھے جن کا جواب 1930ء میں الیکٹران خردبین کے اور پھر 1953ء میں DNA کی دریافت کے بعد سائنس دانوں کی سمجھ میں آنا شروع ہوا۔ 1953ء میں دو امریکی سائنس دانوں فرانسس کرک اور جیمس واٹسن نے جسم کے خلیوں میں DNA نامی مالیکیول دریافت کر لیا۔

مالیکیول کئی ایٹموں (ذرات) کے ملنے سے وجود میں آتا ہے۔ ہمارا سارا جسم انہی ایٹموں، مالیکیولوں اور خلیوں سے مل کر بنا ہے۔ DNA نامی مالیکیول پر مزید تحقیق و تجربات کے بعد معلوم ہوا کہ اس مالیکیول کی شکل ایک دوسرے پر لپٹے ہوئے دو دھاگوں کی طرح ہوتی ہے۔ اس دھاگے پر ماں اور باپ یعنی ننھیال اور ددھیال کی تمام تر خوبیاں' خامیاں اور خصوصیات کیمیائی کوڈز کی صورت میں موجود ہوتی ہیں۔ انہی کوڈز کو بعد میں جینز Genes کا نام دیا گیا اور اسی سے Genetics یعنی علم جینیات وجود میں آیا۔

جسم اور اس کے اعضاء

اگر ہم اپنے جسم کی تعمیر کا جائزہ لیں تو اس کی ترتیب یا ترکیب اس طرح ہوگی:

1۔ بہت سے ایٹم مل کر مالیکیول بناتے ہیں۔

2۔مالیکولز کے مجموعے سے آرگےنلس (Organells) بنتے ہیں۔یہ خلیے (Cell) کے اجزاءہوتے ہیں۔(ہمارے جسم میں کم وبیش 100 کھرب (ٹریلین)خلیے پائے جاتے ہیں)

3۔آرگےنلس مل کر خلیے کی تشکیل کرتے ہیں۔

4۔بہت سے خلیوں کے ملنے سے جسم کے بافتے(Tissues) بنتے ہیں۔

5۔بافتوں کے مجموعے سے عضو(مثلاً جگر)بنتا ہے۔

6۔کئی عضومل کرجسم کاایک نظام(مثلاً منہ،آنتیں،معدہ)بناتے ہیں۔

7۔مختلف نظاموں کے ملنے سے انسانی جسم مکمل شکل اختیار کرتا ہے۔

(انسان کے 5 حواس ہیں۔پورے جسم کے اندر کل 12 نظام پائے جاتے ہیں جن میں سے کسی ایک کے بغیر بھی زندگی ممکن نہیں ہے۔اسی طرح پیچوٹری گلینڈ سے 12 ہارمون خارج ہوتے ہیں جو پورے انسانی جسم اوراس کی کارکردگی کوکنٹرول کرتے ہیں)۔

(حوالہ: How Body Works)

غیب کی دنیا

DNA دراصل Deoxyribo Nucleic Acid کامخفف ہےاور یہ کیمیکل خلیے میں پایا جاتا ہے۔خلیہ کتنا بڑا ہوتا اس کا اندازہ آپ اس طرح کر سکتے ہیں کہ اس تحریر کے دو الفاظ کے درمیانی جگہ میں کم وبیش پانچ لاکھ خلیے بہ آسانی سما سکتے ہیں۔اس ناقابل بصارت اور ناقابل تصور سائز کے ہر خلیے میں DNA، چھ سو خامرے، ایک ہزار توانائی گھر اور بہت سے دوسرے نظام بھی پائے جاتے ہیں۔

DNA خون کے سرخ خلیوں کے سوا جسم کے ہر خلیے میں پایا جاتا ہے۔DNA کے دو دھاگوں کونکال کرایک لائن میں رکھا جائے تو یہ لمبائی دو میٹر کے قریب ہوتی ہے۔اگر جسم کے تمام خلیوں سے DNA کے دھاگوں کونکال کرایک لائن میں رکھا جائے تو یہ لمبائی زمین اور چاند کے درمیانی فاصلے سے دس ہزار گنا زیادہ ہوگی۔

ان دہرے کمانی دار دھاگوں کو ڈبل ہیلکس (Double Helix) کہا جاتا ہے۔ ان دھاگوں پر ماں اور باپ کی تمام تر خصوصیات کیمیائی کوڈز کی شکل میں موجود ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک دھاگا باپ کی طرف سے ہوتا ہے اور ایک ماں کی طرف سے۔ DNA پر وہ تمام تفصیلات پائی جاتی ہیں جن کی مدد سے ایک ننھا سا خلیہ ایک مکمل انسان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

یہ ہدایات کوڈز کی شکل میں ہوتی ہیں اور یہ کوڈز صرف چار کیمیکلز پر مشتمل ہوتے ہیں۔ لیکن ان چار کیمیکلز میں سے کسی بھی تین کیمیکلز کے ملنے سے ہزاروں لاکھوں ہدایات بنتی ہیں۔ مثلاً بچے کا جسم کس طرح تعمیر ہوگا، کون سا عضو کہاں لگے گا۔ جسمانی ساخت، صحت، رنگ، چال ڈھال، قد قامت، آواز، لہجہ، بالوں، جلد، بالوں اور آنکھوں کا رنگ کیسا ہوگا۔ ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی کی طرف سے آنے والی کون کون سی خصوصیات اس بچے میں آئیں گی اور کون سی اگلی نسلوں میں منتقل ہوں گی۔ کس عمر میں اسے کون سی بیماریاں لاحق ہوں گی۔ جسم کو تا حیات زندہ و برقرار رکھنے کے لیے جسم کے نظاموں کو کیا اور کس طرح کرنا ہوگا، جسم کی تعمیر میں استعمال ہونے والا خام مال کہاں سے کب، کتنا اور کس طرح آئے گا اور یہ کب کس طرح اور کہاں استعمال ہوگا۔

> ''وہی تو وہ خدا ہے جو رحم مادر میں تمہاری صورت جیسی چاہتا ہے بناتا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی رب (اور) دانا ہے''۔ سورہ آلِ عمران آیت نمبر ۶۔

یہ سب تفصیلات، پروگرام، منصوبہ یا پلان DNA پر موجود ہوتا ہے اور زندگی کے آغاز کے ساتھ ہی یہ ہدایات ایک سے دوسرے خلیے میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ جسم کے سارے اعضاء اور نظاموں کی تعمیر اسی نقشے کے مطابق ہوتی ہے اور نو ماہ یا اس سے کم مدت میں ایک انسان نوزائیدہ بچے کی صورت میں دنیا میں آنکھ کھولتا ہے۔ اس کے بعد بھی اس کے نشو ونما کے تمام مدارج ہر خلیے میں موجود DNA کے پروگرام اور اس کے حکم کے مطابق ہی سرانجام پاتے ہیں۔

دلچسپ اور حیران کن بات یہ ہے کہ نہ یہ بار آور خلیہ انسانی آنکھ کو نظر آتا ہے اور نہ DNA

کے نظام تک کسی کی بصارت پہنچ سکتی ہے۔ خلیے جو ہر عضو کا بہت چھوٹا یونٹ ہوتے ہیں انہیں بھی آنکھ سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ DNA کے دھاگوں کو بھی دیکھنے کے لیے الیکٹران خردبین درکار ہوتی ہے۔

یہ سارا نظام جہاں زندگی اور موت کے فیصلے ہوتے ہیں سب عالمِ غیب میں رہتا ہے اور کسی کی مداخلت کے بغیر اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق انسانوں اور دوسرے ذی حیات کی تعمیر کرتا ہے، انہیں صحت مند رکھتا ہے اور نارمل زندگی گزارنے میں ان کی مدد کرتا ہے۔

DNA خلیے جسم کی پوری مملکت کا ایک سخت گیر منتظم ہوتا ہے۔ تمام خلیے مجبور ہوتے ہیں کہ DNA کے احکامات پر عمل کریں۔

چیک اینڈ بیلنس

1970ء میں ماہرین نے دیکھا کہ جب DNA اپنی کاپی دوسرے خلیے میں منتقل کررہا ہوتا ہے تو اچانک ہی ایک خاص مادہ منتقلی کے اس عمل میں مداخلت کرتا نظر آتا ہے۔ اِن ٹرون نامی اس مادے کو ابتداء میں ایک اتفاقی واقعہ سمجھا گیا لیکن بعد کی تحقیق سے یہ بات سامنے آئی کہ اِنٹرون (intron) ڈی این اے کے چیک اینڈ بیلنس کا حصہ ہے اور اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ جینز (وراثتی خصوصیات) کی ایک خلیے سے دوسرے خلیے میں منتقلی کے عمل میں کوئی خرابی پیدا نہ ہو اور جینز (Genes) بالکل درست انداز میں دوسرے خلیے میں منتقل ہو جائیں۔

ذی حیات کی تخلیق و تشکیل کے لیے اللہ تعالیٰ پردۂ غیب میں اس قدر عظیم الشان انتظامات نہ کرے تو ممکن ہے انسانوں کے کانوں کی جگہ سینگ نکل آئیں۔ ناک لمبی ہو کر سینے تک لٹک جائے۔ تتلیاں رنگ بکھیرنے کی بجائے زہریلے حشرات میں تبدیل ہو جائیں۔ وھیل خشکی پر نکل آئیں اور صحرائی اونٹ سمندر کی تہوں میں جا کر زندگی گزارنا شروع کردیں۔

(حوالہ: DNA۔ جسم کی کتاب ہدایت)

نوٹ: قبل از وقت موت

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنی گفتگو میں ایک حیران کن بات یہ بھی بتائی کہ ”خواہ اس کی عمر دراز ہو یا وہ اپنی مدتِ حیات اس سے پہلے ہی ختم کر لے“۔ امامؑ نے یہ فرما کر ایک حیران کن سائنسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ آیئے اس جملے کو میڈیکل سائنس کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔

ہماری گردن پر سامنے کی جانب ایک غدود (Gland) پایا جاتا ہے۔ اس گلینڈ کو تھائی رائیڈ گلینڈ کہا جاتا ہے۔ تھائی رائیڈ جسم کو حاصل ہونے والی توانائی کو اعتدال کے ساتھ خرچ کرنے کا ذمے دار ہے۔ جسم میں موجود توانائی کو ضرورت کے مطابق خرچ کرتا ہے لیکن اس میں اگر کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو جسم میں موجود توانائی تیزی سے خرچ ہونے لگتی ہے۔

اس کی وجہ سے انسان سب کچھ کھانے پینے کے باوجود بھی بہت جلد موت کا شکار ہو سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح چراغ کی لو مدہم رکھی جائے تو وہ صبح تک جل سکتا ہے۔ اگر اس کی لو بڑھا دی جائے تو وہ اپنی توانائی تیزی سے خرچ کر کے بہت جلدی بجھ جاتا ہے۔

اس کے علاوہ زندگی حادثات سے بھری ہوئی ہے۔ انسان کی عمر مثلاً 80 سال ہے لیکن اگر وہ تیس سال کی عمر میں نشہ استعمال کرنا شروع کر دے تو زندگی بہت جلد ختم ہو سکتی ہے۔ عمر دراز ہونے کے باوجود ممکن ہے کوئی شخص حالات سے گھبرا کر خودکشی کر لے یا غیر محتاط ڈرائیونگ کے سبب موت کا شکار ہو جائے۔ زلزلے، حادثات اور باقی امراض سے ہونے والی اموات بھی اس کی ایک مثال ہیں۔

اعضاء خودکار انداز میں کام کرتے ہیں

آپ غور فرمائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جسم کے بیشتر افعال میں آپ کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ مثلاً سانس لینا اور دل کا دھڑکنا خود بہ خود جاری رہتا ہے، گردے اور جگر ہماری کوشش کے بغیر کام کرتے ہیں، آنکھیں ہمیں خود بہ خود راہ دکھاتی ہیں، کان سناتے ہیں، ناک سنگھاتی ہے، خون خود بہ خود جسم میں سفر کرتا ہے، غذا ایک خودکار نظام کے تحت جزو بدن بنتی رہتی ہے اور جسم کی غلاظتیں

ایک خودکار نظام کے تحت جسم سے نکلتی ہیں۔

یہ سب کام اگر ہمیں خود اپنے ارادے اور اپنی کوشش سے کرنا پڑتے تو ہماری زندگی انتہائی تلخ، ناگوار اور بہت مختصر ہوا کرتی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے جسم کے اندر ہی ایک خودکار نظام قائم کیا کہ ہم ناگواری اور مشکل سے بچے رہیں اور یکسوئی کے ساتھ وہ کام کرسکیں جن کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے۔

امام علیہ السلام کے صرف ایک جملے کی کسی قدر تفصیل ہم نے آپ کے لیے بیان کی تاکہ ہمارے قارئین امام علیہ السلام کے کلام کو گہرائی کے ساتھ سمجھ سکیں اور لذت شکر میں ہمارے ساتھ شریک ہوسکیں۔ (اگر آپ DNA کے بارے میں تفصیل سے جاننا چاہیں تو ہماری کتاب "DNA جسم کی کتاب ہدایت" کا مطالعہ کریں۔)

باب: 9

عظیم فضیلت جو صرف انسان کو عطا کی گئی

امام جعفر صادق علیہ السلام نے انسانی جسم کی نشو ونما اور اس کے حیران کن انتظامات پہ گفتگو کرنے کے بعد مفضل ابن عمرؒ کو اس فضیلت کی طرف متوجہ فرمایا جو انسانی جسم کے سوا کسی دوسرے ذی حیات کے جسم میں نہیں پائی جاتی۔

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"مفضل! کیا تم نے کبھی غور کیا کہ انسان کو اپنی خلقت یعنی جسم کی بناوٹ میں دوسرے تمام جانداروں کی نسبت جو عظیم فضیلت حاصل ہے، وہ اس کا دو پاؤں پر سیدھے ہو کر کھڑا ہونا ہے۔ یہ صلاحیت دوسرے ذی حیات مثلاً پرندوں، درندوں چوپایوں اور دودھ پلانے والے جانداروں کو (اس معیار کی) حاصل نہیں ہے۔

یہ ایک عظیم صلاحیت، اللہ کا ایک عظیم احسان ہے جو پروردگار نے انسانوں پر کیا ہے لیکن لوگ اس کی عظمت واہمیت پر غور نہیں کرتے۔

اپنی اس منفرد صلاحیت کے سبب انسان سیدھا کھڑا ہو سکتا ہے اور اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے ہزاروں طرح کے کام سرانجام دے سکتا ہے۔ دوسرے جاندار چاروں ہاتھوں پیروں کی مدد سے چلتے ہیں جب کہ انسان دو پیروں سے چلتا پھرتا ہے اور دو

ہاتھوں کی مدد سے کام کرتا ہے۔ اگر انسان کو بھی دوسرے چوپایوں کی طرح (رُوبہ زمین) خلق کیا گیا ہوتا تو ہاتھوں سے کسی بھی قسم کا کام کرنا اس کے لئے ممکن نہ ہوتا۔"

نوٹ: ریڑھ کی ہڈی......قدرت کی انجینئرنگ کا عظیم شاہکار

دوسرے جانداروں کی نسبت انسان کے لئے سیدھے کھڑے ہوکر دو پیروں سے چلنا دراصل اس کی ریڑھ کی ہڈی کی حیران کن ساخت کے سبب ممکن ہوتا ہے۔

آیئے ایک نظر ڈالیں کہ یہ ریڑھ کی ہڈی ہے کیا؟ اس کی بناوٹ کس طرح دوسرے جانداروں کی ریڑھ کی ہڈی سے مختلف ہے؟ اور یہ ہمارے لئے، ہماری زندگی کے لئے اور زندگی کے ہر لمحے میں ہزاروں لاکھوں کاموں کو سرانجام دینے میں ہماری کس طرح مدد کرتی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ہماری ریڑھ کی ہڈی قدرت کی انجینئرنگ کا ایک بالکل منفرد اور حیران کن شاہکار ہے۔ آج جو انسان سر اٹھا کر، سینہ تان کر، دو پیروں پر کھڑا ہوتا ہے تو یہ اللہ کے اس احسان کے سبب ہے جو اللہ تعالیٰ نے صرف انسانوں پر کیا ہے اور وہ احسان ہے ہماری ریڑھ کی ہڈی۔

دوسرے جانداروں مثلاً گائے بھینس، گھوڑے، بکری بھیڑ وغیرہ کی ریڑھ کی ہڈیاں چھت کو سہارا دینے والے شہتیر کی طرح ہوتی ہیں اسی لیے یہ جانور دو پاؤں پر سیدھے نہیں کھڑے ہو سکتے جب کہ ہماری ریڑھ کی ہڈی ہمیں جھکنے مڑنے، سیدھا کھڑا ہونے اور گردن کو 180 زاویوں پر گھمانے میں ہر روز لاکھوں مرتبہ ہماری مدد کرتی ہے۔

چلیں دوسرے کاموں کو چھوڑیں، صرف نماز ہی کی مثال لے لیں۔ وضو، قیام، رکوع، سجدے اور پھر سجدے سے اٹھنے میں، دعا کے لئے ہاتھ بلند کرنے میں ریڑھ کی ہڈی کس کس طرح اور کن کن زاویوں سے ہماری مدد کرتی ہے۔ یہ ریڑھ کی ہڈی پورے جسم کا بوجھ برداشت کرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے سر اور گردن کا بوجھ بھی اٹھاتی ہے۔ (اب اگر ہم نماز کے دوسرے سجدے

کے بعد اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہتے ہیں "بحول اللہ وَ قوتہ واقوم وا قعود" تو یہ کس قدر مناسب حال حمد ہے!)

اعصابی نظام

جسم اور دماغ کے درمیان رابطے کا پورا نظام ریڑھ کی ہڈی کے درمیان سے گزرتا ہے۔ کمیونی کیشن کا یہ نظام ایک موٹے کیبل (Cable) کی شکل میں ریڑھ کی ہڈی کے مہروں کے درمیان سے ہوتا ہوا دماغ میں جاتا ہے۔ اسے اسپائینل کورڈ (Spinal Cord) کہا جاتا ہے۔ اس "کیبل" کے اندر ہزاروں لاکھوں تار (ریشے) موجود ہوتے ہیں۔ یہ ریشے ہمارے اعصابی نظام کا حصہ ہیں۔ یہ اعصاب پیر کے ناخن سے کھوپڑی تک ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر لمحہ جسم سے دماغ اور دماغ سے جسم کے مختلف حصوں تک لاکھوں، کھربوں پیغامات اسی اعصابی نظام کے ذریعے سفر کرتے ہیں۔ جسم دماغ کو ہر لمحے ہزاروں نت نئی اطلاعات فراہم کرتا رہتا ہے اور دماغ ان اطلاعات کی بنیاد پر نئی حکمت عملی طے کرتا اور نئے احکامات جاری کرتا رہتا ہے۔ اگر اطلاعات واحکامات کا یہ مواصلاتی نظام اور اس کے ذریعے جسم ودماغ کا باہمی رابطہ کسی سبب سے منقطع ہو جائے تو جسم کے نادر ونایاب اعضاء، آلات، پیچیدہ مشینیں اور پراسرار کارخانے ایک لمحے میں ناکارہ ہو جائیں اور انسان لمحہ بھر میں ساکت، بے جان، بے حس ہو کر زمین کے بوجھ میں تبدیل ہو جائے۔

ریڑھ کی ہڈی کی بناوٹ

اگر آپ ریڑھ کی ہڈی کی بناوٹ کا معائنہ کریں تو قدرت کی اس اعلیٰ ٹیکنالوجی کو دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔ ریڑھ کی ہڈی ایک نہیں بلکہ بہت سے مہروں کا مجموعہ ہے۔ گردن کے اوپر سے شروع ہونے والے سات مہروں کو سروائی کل (Cervical) کہا جاتا ہے۔ یہ مہرے آپ کو اس قابل بناتے ہیں کہ آپ اپنی گردن کو 180 زاویوں پر گھما سکیں۔ سر کا وزن سنبھالنے کا کام بھی یہی مہرے سرانجام دیتے ہیں۔

درمیان کے مہروں کو تھوروسک (Thorasic) کہا جاتا ہے ان کی تعداد بارہ ہوتی ہے۔ یہ آپ کی پسلیوں سے جڑے ہوتے ہیں۔ انہیں زیادہ حرکت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ان کے نیچے ریڑھ کی ہڈی کے آخری پانچ مہرے ہوتے ہیں۔ یہ بے حد مضبوط بنائے گئے ہیں۔ جسم کا وزن سنبھالنا انہی مہروں کی ذمہ داری ہے۔ انہیں لمبر (Lumber) کہا جاتا ہے۔ ان کے آخر میں خاص ہڈی ہے جو پانچ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے مہروں سے بنی ہے۔

بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس وقت اس کی ریڑھ کی ہڈی تقریباً سیدھی ہوتی ہے۔ جب بچے کا ہلتا ہوا سر ٹھہرتا ہے تو گردن کے اوپر والے مہروں میں بھی ذرا سا خم پیدا ہو چکا ہوتا ہے۔ جب بچہ گھٹنیوں کے بل چلنا شروع کرتا ہے تو درمیان والے مہروں میں ذرا سا ابھار آجاتا ہے۔ اس طرح ریڑھ کی ہڈی بتدریج لہراتی ہوئی رسی کی شکل کی ہو جاتی ہے۔

اس میں اللہ تعالیٰ کی عظیم مصلحتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ اگر ریڑھ کی ہڈی بالکل سیدھی رہتی تو جھٹکوں کو برداشت نہیں کر سکتی تھی اور کسی بھی دن درمیان سے چٹخ جاتی۔ لیکن یہ اپنے اندر پیدا ہونے والے خم اور لچک کی وجہ سے جھٹکوں کو برداشت کرنے کی کئی گنا زیادہ صلاحیت حاصل کر لیتی ہے۔

ریڑھ کی ہڈی کے جن مہروں کا ہم نے تذکرہ کیا، ان میں سے ہر دو مہروں کے درمیان چپٹی ہڈی سے بنے ہوئے پیڈ یا نرم گدیاں ہوتی ہیں۔ ان پیڈز کو ڈسکس (Discs) کہا جاتا ہے۔ یہ پیڈ اوپر سے کان کی لو جیسے ہوتے ہیں اور ان کے اندر جیلی جیسا مادہ بھرا ہوتا ہے۔ یہ پیڈز اور جیلی جیسا مادہ مہروں کو ایک دوسرے سے ٹکرانے سے محفوظ رکھتا ہے۔ اگر کسی بڑے جھٹکے یا حادثے کی وجہ سے ان میں سے کوئی پیڈ پھٹ جائے تو وہ انسان چلنے پھرنے سے محروم ہو سکتا ہے۔

آج انسانوں کی دوسرے ذی حیات پر فوقیت، تمام سائنسی ترقی، ٹیکنالوجی کے تمام کارنامے، علم و ادب اور آرٹ کے سارے نمونے، طرز تعمیر کے سارے عظیم شاہکار، طرح طرح کی سواریاں، عالیشان سڑکیں اور راستے، صنعت و حرفت، کھیتی باڑی، کرۂ آبی سے دوسرے سیاروں تک رسائی

......یہ سب چیزیں انسان کے اندر پائی جانے والی ریڑھ کی ہڈی کی مرہونِ منت ہیں۔ اگر انسان کی ریڑھ کی ہڈی بھی دوسرے حیوانوں، چوپایوں کی طرح ہوتی تو انسان کا جسمانی طور پر اشرف المخلوقات کے درجے پر بلند ہونا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ (حوالہ از: جسم کے عجائبات)

حواسوں کی ضرورت

اس کے بعد امام علیہ السلام نے مفضل ابن عمرؓ کو انسانی جسم میں موجود حاسّوں مثلاً آنکھ، ناک، کان، زبان اور جلد میں موجود حساس اعصابی نظام کی طرف متوجہ فرمایا۔ آپؑ نے کہا:

"مفضل! اب ذرا ان حاسّوں پر غور کرو جو آدمی کے جسم میں پیدا کیے گئے اور ان کے ذریعے انسان کو عزّ و شرف عطا کیا گیا۔ دوسرے جانداروں کو ان حاسوں (اعضاء) کے سبب وہ عزّ و شرف حاصل نہیں جو انسانوں کو حاصل ہوتا ہے۔"

(یہ حاسّے دوسرے جانداروں میں بھی پائے جاتے ہیں لیکن انسانی جسم میں ان کی کارکردگی کا معیار دوسرے ذی حیات کے مقابلے میں بے حد ترقی یافتہ اور جدید ہے)

آنکھیں سر میں کیوں بنائی گئیں

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"مثلاً ذرا آنکھوں ہی پر غور کرو کہ آنکھیں کس طرح جسم کے ایک خاص مقام پر بنائی گئیں۔"

(اگر جسم انسانی کا کوئی خالق نہ ہوتا، اس کی تعمیر کے پیچھے ایک خاص پروگرام یا منصوبہ نہ ہوتا، یہ خود بہ خود پیدا ہو گیا ہوتا تو کسی شخص کا کوئی عضو جسم کے کسی مقام پر ہوتا اور کسی کا وہی عضو کسی اور مقام پر پایا جاتا)

امام علیہ السلام نے فرمایا:

''دیکھو! یہ آنکھیں جسم کے سب سے بلند اور مناسب مقام پر بنائی گئیں اور سامنے کی طرف بنائی گئیں۔ جس طرح چراغ دان میں چراغ رکھا ہوتا ہے تاکہ سامنے کی طرف موجود ہر چیز کو دیکھا جا سکے۔

یہ آنکھیں جسم کے نچلے حصے میں نہیں بنائی گئیں۔ اگر یہ آنکھیں ہاتھوں میں ہوتیں یا انہیں پیروں کے اندر لگا دیا جاتا (یا پھر سر کے اگلے حصے کے بجائے یہ سر کے عقبی حصے میں ہوتیں)۔

آنکھیں اگر ان مقامات پر ہوتیں تو آگے دیکھنے کے لئے انسان کو بار بار، اُچھلنا پڑتا۔ ان مقامات پر آنکھیں ہوتیں تو بہت جلد خراب ہو جاتیں۔ انسان کے لئے یہ ممکن نہ ہوتا کہ وہ سامنے اور اطراف کے منظر کو دیکھ پاتا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کی آنکھیں جسم کے سب سے بلند اور محفوظ مقام پر بنائیں اور انہیں ہڈیوں کے خول میں اس طرح رکھا جس طرح چراغ کو چراغ دان میں رکھا جاتا ہے۔''

نوٹ: آنکھیں جسم کے اسکینرز

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس زمانے کے لوگوں کی عقل وفہم کے پیش نظر آنکھوں کے بارے میں جو کچھ مختصراً فرمایا، اسے میڈیکل سائنس اور فزیالوجی (علم فعلیات) کی تازہ ترین

معلومات کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔

آنکھ کا سائز تو آپ نے دیکھا ہی ہے۔اس قدر مختصر سائز کے باوجود عقل کو ششدر کر دینے والی انتہائی نازک ٹیکنالوجی کے ایک جگہ جمع ہو جانے میں جسم کا کوئی دوسرا عضو آنکھ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اس مختصر سی جگہ میں اس قدر اعلیٰ ٹیکنالوجی استعمال کی گئی ہے کہ ہر آنکھ بیرونی دنیا سے بیک وقت 15 لاکھ پیغامات وصول کر کے انہیں دماغ میں موجود مرکزِ بصارت تک پہنچاتی رہتی ہے۔

آنکھیں دراصل دماغ کے لیے کسی (Scanner) کی طرح کام کرتی ہیں۔ ماں کے پیٹ سے نکلنے سے لے کر زمین کے پیٹ میں جانے تک انسان اس دنیا میں جو کچھ دیکھتا ہے، آنکھیں ان سب چیزوں، چہروں، شکلوں، نظاروں، عمارتوں، جانوروں، پہاڑوں، سمندروں، آسمانوں، سورج، چاند، ستاروں غرض ہر چیز کو اسکین کر کے انہیں برقی کیمیائی سگنلز کی شکل میں دماغ کو ارسال کرتی رہتی ہیں۔ دماغ ان تفصیلات کو اپنی ''زبان'' میں منتقل کر کے ان کی الگ الگ فائلیں بنا کر اپنے اندر محفوظ کرتا رہتا ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں جو بھی معلومات حاصل کرتے ہیں، ان میں سے 80 فیصد معلومات آنکھیں ہی ہمارے اردگرد کی دنیا سے جمع کرتی ہیں۔

دیکھنے کے عمل کا آغاز

دیکھنے کے عمل کی ابتداء آنکھ کی پتلی (Pupil) سے ہوتی ہے۔ روشنی کی لہریں جب اس پتلی میں داخل ہوتی ہیں تو اس سے پہلے پتلی کے اوپر موجود قرنیہ (Cornea) کا نیم بیضوی کور (Cover) روشنی کی لہروں کو مخصوص زاویوں اور ایک خاص انداز سے موڑتا ہے اور ترچھا کر کے انہیں پتلی کے اندر داخل کرتا ہے۔

پتلی کے پیچھے آنکھ کا عدسہ (Lens) موجود ہے۔ یہ عدسہ ایک سیال مادے سے بھرا رہتا ہے اور اس کے چاروں طرف ناقابل تصور حد تک ننھے ننھے پٹھے ہیں۔ جب یہ پٹھے سکڑتے ہیں تو آپ قریب کی چیزوں کو واضح طور پر دیکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور جب یہ پٹھے پھیلتے ہیں تو

آپ دور دراز کی اشیاء کو بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں۔ اب آپ تصور کریں کہ قریب اور دور دیکھنے کا عمل آپ دن میں کتنی مرتبہ دہراتے ہیں۔ اگر قریب اور دور دیکھنے کی یہ مفت سہولت انسان کو دستیاب نہ ہو تو اس کی زندگی میں کس قدر دشواریاں پیدا ہو جائیں!

دونوں آنکھوں کے 26 کروڑ 14 لاکھ خلیے

آنکھ کا پردہ (Retina) پیاز کے چھلکے کی طرح ہوتا ہے۔ اس کا سائز ایک اسکوائر انچ سے بھی کم ہے لیکن اس میں روشنی کے پیغامات کو وصول کرنے والے تیرہ کروڑ ستر لاکھ خلیے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے 13 کروڑ خلیے سفید اور سیاہ رنگوں سے منعکس ہونے والی روشنی کے لئے مخصوص ہیں جب کہ 70 لاکھ خلیے تین بنیادی رنگوں اور ان کے امتزاج سے بننے والے لاکھوں کروڑوں رنگوں کو محسوس کرنے کی خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ دونوں آنکھوں میں موجود خلیوں کی مجموعی تعداد 26 کروڑ 14 لاکھ بنتی ہے۔

برقی کیمیائی عمل

رات کے اندھیرے میں جیسے ہی کوئی جگنو چمکتا ہے تو آپ کی آنکھوں کے اندر ایک انتہائی پیچیدہ برقی کیمیائی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ جگنو کی مدھم سی روشنی آنکھوں میں موجود 26 کروڑ خلیوں میں موجود سرخی مائل مادّے کے رنگ کو ختم کر دیتی ہے۔ بلیچنگ (رنگ اڑنے) کے اس کیمیائی عمل کی وجہ سے ایک ہلکی سی (وولٹ کے کئی کروڑویں حصے کے برابر) برقی رو پیدا ہوتی ہے۔

یہ برقی رو (یعنی کرنٹ) تین سو میل فی گھنٹا کی رفتار سے آنکھوں کے عقبی حصے اور دماغ کے درمیان موجود آپٹک نرو (Optic Nerve) میں داخل ہو جاتی ہے۔ دماغ اس برقی سگنل (یا برقی سگنلز) کو ڈی کوڈ کر کے اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے کہ نظر آنے والی شے ایک جگنو ہے۔ اس کے ساتھ ہی جگنو سے متعلق پہلے سے حاصل شدہ معلومات بھی آپ کو یاد آ جاتی ہیں۔

یہ تمام پیچیدہ برقی کیمیائی عمل ایک سیکنڈ کے اعشاریہ صفر صفر دو (.002) ویں حصے میں مکمل ہو جاتا ہے۔

کیا مادّہ یہ معجزے رونما کرسکتا ہے؟

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"مفضل! ذرا غور تو کرو کہ کیا ایک بے شعور مادے میں یہ صلاحیت ہو سکتی ہے کہ وہ انسانی خلقت میں اتنی مناسبتوں کے ساتھ اس قدر پیچیدہ اور حیران کن انتظامات کر سکے؟"

باب: 10

پانچ حواس اور ان کے کام

امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل ابن عمرؓ سے گفتگو کرتے ہوئے انہیں جسم کے ان اعضاء کی جانب متوجہ فرمایا جن کی مدد سے ہمیں اپنے اردگرد کے ماحول، روشنی، تاریکی، گرمی، سردی، اشیاء، آوازوں اور خود اپنے ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ یہ اعضاء ہیں..... آنکھیں، کان، ناک، زبان اور ہماری جلد۔ انہی کی مدد سے ہم دیکھ سکتے ہیں، سن سکتے ہیں، سونگھ سکتے ہیں، چکھ سکتے ہیں خود کو اور دوسری چیزوں کو محسوس کر سکتے ہیں۔ یہ پانچ اعضاء، پانچ حاسے ہیں جو ہمیں پانچ حواس عطا کرتے ہیں۔

امام علیہ السلام نے فرمایا:

> ''دیکھو مفضل! آنکھیں اس لئے عطا کی گئیں کہ ہم ہر طرح کے رنگوں کو محسوس کر سکیں۔ اب دیکھو اگر آنکھیں ہوتیں لیکن رنگ نہ ہوتے، یا اس کے برعکس رنگ ہوتے اور آنکھیں نہ ہوتیں تو پھر پہلی صورت میں آنکھوں اور دوسری صورت میں رنگوں کا ہونا بے فائدہ ہوتا۔
>
> اسی طرح کانوں کا معاملہ ہے۔ کانوں کو اللہ تعالیٰ نے سر کے دونوں جانب ایک خاص مناسبت کے ساتھ بنایا تاکہ یہ ہر طرف سے آنے والی آوازوں کو پوری طرح محسوس کر سکیں۔ اب اگر کان ہوتے اور آوازیں نہ ہوتیں، یا آوازیں ہوتیں اور

انہیں سننے والے کان نہ ہوتے تو آوازوں کا وجود بے فائدہ ہوتا

یا پہلی صورت میں کانوں کے ہونے کا کوئی مقصد نہ ہوتا۔ اسی

طرح دوسرے حاسوں (اعضاء) پر غور کرو۔"

نوٹ: کوئی چیز بے سبب نہیں ہوتی

مثلاً اگر دنیا میں ذائقے ہوتے اور ان سے لذت پہنچانے والی زبان نہ ہوتی تو دنیا کے سارے ذائقے بے مقصد ہوتے۔ اگر قوت لامسہ (چھوکر محسوس کرنے والی قوت) نہ ہوتی تو گرمی، سردی، نرمی، سختی کے ہونے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ اسی طرح اگر قوت لامسہ تو ہوتی لیکن گرمی، سردی، نرمی، سختی وغیرہ کا وجود نہ ہوتا تو قوت لامسہ کا وجود بیکار ہوتا۔ خوشبوئیں ہوتیں اور ناک نہ ہوتی یا ناک تو ہوتی مگر خوشبوئیں نہ ہوتیں تو دونوں میں سے کوئی ایک چیز مثلاً ناک یا خوشبو بے فائدہ ہوتی۔

حواس اور محسوس ہونے والی چیزیں

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"تو مفضل! ذرا غور تو کرو اس بات پر کہ خالق و مالک اللہ نے

کس طرح یہ مقدر کر دیا کہ ایک چیز دوسرے کو محسوس کرے اور ہر

حاسّے (عضو) کے لئے (اردگرد کے ماحول سے) کسی "محسوس"

کو مقرر کر دیا جو اس میں اپنا عمل کرے اور اس کے بارے میں

(تمہیں) بتائے۔"

نوٹ: حاسّے ایک دوسرے سے قریب مگر

یعنی آنکھ کا کام صرف دکھانا ہے، کان سناتے ہیں، زبان چکھاتی ہے، ناک سنگھاتی ہے، جلد محسوس کراتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے یہ اعضاء ایک دوسرے سے چند سینٹی میٹر یا چند

انچ کے فاصلے پر ہوتے ہیں لیکن آنکھ کو نہیں معلوم کہ کان نے کیا سنا، کان کو نہیں معلوم ہوتا کہ آنکھ نے کیا دیکھا، زبان جو ذائقہ محسوس کرتی ہے اس کے بارے میں باقی حاسوں، کان، آنکھ، ناک یا جلد کو کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ اسی طرح زبان کے لئے بھی ممکن نہیں کہ وہ باقی حاسوں کی اطلاعات تک رسائی حاصل کر سکے! یہ ساری معلومات صرف اور صرف دماغ کو حاصل ہوتی ہیں۔

حاسّوں اور محسوسات کے درمیان ایک واسطہ!

امام علیہ السلام نے اس کے بعد مفضل بن عمرؓ کو ایک اور حیران کن حقیقت کی طرف متوجہ فرمایا۔ یہ ایسی حقیقت تھی جس کے بارے میں جدید سائنسی دور کے سائنسدان بھی انیسویں صدی کے آخر تک کسی حتمی نتیجے تک پہنچنے میں ناکام رہے۔ (اس کی تفصیل سائنس کے طالب علم جانتے ہیں)

امام علیہ السلام نے فرمایا:

> دیکھو مفضل! ''یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ حاسوں اور محسوس کی جانے والی چیزوں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے کچھ واسطے قرار دیے۔ جیسے روشنی اور ہوا...... اگر روشنی کا وجود نہ ہوتا تو آنکھیں کسی بھی رنگ کو محسوس نہیں کر سکتی تھیں اور اگر ہوا نہ ہوتی جو آوازوں کو کانوں تک پہنچاتی ہے تو کان کسی بھی قسم کی آواز سننے سے قاصر رہتے۔''

(اسی طرح پانی کا معاملہ ہے۔ غذا کا ذائقہ زبان اسی وقت محسوس کر سکتی ہے جب وہ لعاب دہن کے ساتھ مل کر کسی قدر نیم سیال میں تبدیل ہو جائے۔ آئس کریم کا مزہ آپ کو اس وقت آتا ہے جب وہ منہ میں پگھل جاتی ہے)

نوٹ: حاسے اوران کی صلاحیتیں میڈیکل سائنس کی روشنی میں

امام علیہ السلام نے آج سے کم وبیش ساڑھے بارہ سوسال پہلے جو کچھ فرمایا، وہ اس زمانے کے انسانوں کے علم اور ذہنی سطح کے مطابق بیان کیا اور اپنی بات کو مختصراً بیان کیا۔ ہم امام علیہ السلام کے ارشادات کو جدید میڈیکل سائنس کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا کسی قدر ادراک کرسکیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس دنیا میں زندہ رہنے کے لئے عطا کی ہیں۔

آنکھوں کے بارے میں آپ گزشتہ باب میں پڑھ چکے ہیں۔ اس باب میں ہم کانوں کے بارے میں کسی قدر معلومات آپ کی خدمت میں پیش کررہے ہیں۔

کان......ایک عظیم نعمت

کان ہمارا آلۂ سماعت یا یوں کہہ لیں کہ یہ ایک ''ہئیرنگ کمپیوٹر'' ہے۔ کان کو اگر آپ منی ایچرائزیشن کا شاہکار کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ کان کے اندر چھوٹی انگلی کے ناخن کے برابر جگہ میں اتنے الیکٹریکل سرکٹ موجود ہیں کہ اتنے سرکٹس کی مدد سے ایک اچھے خاصے بڑے شہر کو ٹیلی فون کی سہولت بہ آسانی فراہم کی جاسکتی ہے۔

بیرونی کان

کانوں کا بیرونی حصہ جسے ہم کان کہتے ہیں اس کا کام کسی ڈش انٹینا کی طرح اردگرد موجود آوازوں کی لہروں کو جمع کر کے انہیں اندرونی کان تک پہنچاتا ہے۔ سننے کے جادوئی عمل کا آغاز اندرونی کان سے ہوتا ہے۔

یہاں سے ایک لمبی اور چھوٹی سی نالی یا ٹیوب اندرونی کان میں موجود ائرڈرم تک جاتی ہے۔ ائرڈرم تنی ہوئی باریک لیکن سخت جھلی سے بنایا گیا ہے' کسی ڈھول پر چڑھی ہوئی جھلی کی طرح۔ آواز کی لہریں اس جھلی سے اسی طرح ٹکراتی ہیں جیسے چھڑی کسی ڈھول سے ٹکراتی ہے۔

کان کے اس پردے (ائرڈرم) کی حساسیت کا اندازہ آپ اس طرح لگا سکتے ہیں کہ یہ حساس پردہ ایک سینٹی میٹر کے ایک ارب ویں حصے کے برابر بھی متحرک ہو تو کان سے دماغ کے مخصوص حصے (مرکز سماعت) تک برقی کیمیائی عمل اور ردِ عمل کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور بالآخر ہوا کی وہ ننھی سی لہر آپ کے لئے ایک بامعنی لفظ یا ایک اہم اطلاع بن جاتی ہے۔

کان کی اندرونی بناوٹ

کان کا مرکز (Middle Ear) بہ مشکل لوبیا کے دانے کے برابر ہے۔ اس جگہ تین مختلف شکلوں کی ہڈیاں نصب ہیں۔ آواز کی لہروں کی وجہ سے کان کے پردے میں جو ارتعاش پیدا ہوتا ہے، ایک ہڈی اسے 22 گنا تیز کر کے اندرونی کان تک پہنچاتی ہے۔

اندرونی کان جو اصل آلۂ سماعت ہے، ایک غار نما قلعے کی طرح ہے اور پانی جیسے سیال مادے سے بھرا رہتا ہے۔ اس کی شکل گھونگھے جیسی ہے۔ اس کے دائروں اور گولائیوں میں گھومتی ہوئی اندرونی نالیاں نادیدہ بال نما اعصابی خلیوں سے بھری ہوتی ہیں۔

یہ خلیے اتنے چھوٹے ہیں کہ انہیں طاقتور خردبین کے بغیر دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر خلیہ آواز کی ایک علیحدہ لہر یا ارتعاش کو محسوس کرنے کے لئے مخصوص ہے اور صرف اس مخصوص ارتعاش ہی کو محسوس کر سکتا ہے۔

سننے کا عمل

جب انگریزی حرف U کی شکل والی ہڈی آواز کی لہر کو اندرونی کان میں کھلنے والی بیضوی کھڑکی کے ذریعے اندر پہنچاتی ہے تو مرکز سماعت کی اندرونی نالیوں میں موجود سیال مادے میں ایک ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً کسی نے آپ کا نام پکارا: ''علی!'' تو سماعت مرکز کے لاکھوں کروڑوں بال جیسے خلیوں میں سے صرف ع..... لی کا ارتعاش محسوس کرنے والے خلیے ہی متحرک ہوں گے۔

ان خلیوں کی حرکت کی وجہ سے ایک بہت مدھم برقی رو پیدا ہوگی جو انتہائی برق رفتاری سے آڈیٹری نرو (Auditory Nerve) میں سرائیت کر جائے گی۔ یہ آڈیٹری نرو پنسل کے سکے جتنی

پتلی ہے اور اس میں 30 ہزار الیکٹریکل سرکٹ بیک وقت کام کرتے ہیں۔ آڈیٹری نروااس برقی رو کو چند سینٹی میٹر کے فاصلے پر موجود دماغ کے مخصوص حصے تک پہنچائے گی۔ اس کے بعد دماغ فیصلہ کرے گا کہ یہ آواز کیا ہے یعنی کس چیز کی آواز ہے۔

آواز اور ردِ عمل

اب آپ تصور فرمائیں کہ ہم بیک وقت کتنی آوازیں سنتے ہیں۔ دماغ آواز کی ان ہزاروں لاکھوں لہروں کے سگنلز الگ الگ کر کے، یکجا کرتا ہے اور ان آوازوں سے متعلق دماغ میں پہلے سے موجود بے شمار معلومات کو ہر آواز کے ساتھ الگ الگ منسلک کر کے آواز کی لہروں کو بامعنی آوازوں اور اطلاعات میں تبدیل کر دیتا ہے تاکہ ہم اور آپ مشینوں کے شور، پنکھے یا اے۔ سی کی مدھم آوازوں، بارش کی پھوار، پرندوں کی چہکار، پتوں کی سرسراہٹ، بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور اپنے دوست یا عزیز کی آواز کو بیک وقت سن سکیں۔ انہیں الگ الگ پہچان سکیں اور ان آوازوں کی بنیاد پر اپنا ردِ عمل طے کر سکیں۔ مثلاً آپ اذان کی آواز سن کر مسجد کی طرف قدم بڑھاتے ہیں اور فائرنگ کی آواز سن کر کوئی محفوظ جگہ تلاش کرنے لگتے ہیں۔

جسم کا توازن کس طرح برقرار رہتا ہے؟

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ہمارے جسم کے توازن پر نظر رکھنا بھی کانوں ہی کی ذمہ داری ہے۔ جسم کے توازن کو برقرار رکھنے کا نظام ہمارے کانوں ہی کے اندر پایا جاتا ہے اور ایک ایک لمحے ہمارے توازن کو برقرار رکھنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔

توازن کے نظام کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہمارے کانوں میں نیم دائروں کی شکل کی تین ننھی منی نالیاں بنائی ہیں۔ انہیں سیمی سرکلر کینال کہا جاتا ہے۔

یہ نالیاں ہر وقت ایک سیال مادے سے بھری رہتی ہیں۔ یہ نالیاں جسم کے اوپر نیچے، آگے پیچھے اور دائیں بائیں سمت کی طرف حرکات کو کنٹرول کرتی ہیں۔ جب آپ کبھی اچانک کسی چکنے فرش پر پھسلتے ہیں تو متعلقہ سمت والی نالی میں سے سیال مادہ غائب ہو جاتا ہے اور اس نالی میں

موجود خلیے اس کی اطلاع فوری طور پر دماغ کو دیتے ہیں۔

دماغ کا وہ حصہ جو ایسی ہنگامی حالت کو کنٹرول کرتا ہے، فوری ایکشن لیتا ہے۔ اگر کوئی شخص بائیں طرف گر رہا ہوتا ہے تو دماغ جسم کے دائیں سمت کے پٹھوں کو سخت ہو جانے کے احکامات جاری کرتا ہے اور اگر دائیں طرف گرنے کا امکان ہو تو دماغ بائیں سمت کے پٹھوں کو سخت ہو جانے اور جسم کو دائیں طرف کھینچنے کا حکم جاری کرتا ہے۔

اگر کسی شخص کے کانوں کے اندر یہ نظامِ توازن کام کرنا بند کر دے تو اسے ہر وقت چکر آتے رہیں گے اور وہ کسی بھی قسم کی حرکت سے معذور ہو سکتا ہے۔

اگر کان نہ ہوتے

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

> "مفضل۔ اب ذرا سوچو کہ اگر کسی شخص کے پاس کان جیسی نعمت موجود نہ ہو تو اس کی زندگی میں کس قدر خلل و خرابی پیدا ہو سکتی ہے۔ نہ وہ کسی کی گفتگو سن سکتا ہے، نہ کسی سے گفتگو کر سکتا ہے۔ نہ وہ اچھی بُری آوازوں کو سن سکے گا۔ اسے کسی بات میں مزہ ہی نہیں آئے گا اور وہ خود بھی اس حالت سے بیزار ہو جائے گا۔ دوسرے لوگ اس سے گفتگو کرنے میں سخت دشواری محسوس کریں گے۔ حتیٰ کہ اس سے چڑ جائیں گے۔ آخر کار وہ ایک طرح کی شدید تنہائی کا شکار ہو جائے گا۔ وہ سب کے ساتھ انہی کی طرح زندہ ہو گا لیکن سارے ماحول اور معاشرے سے کٹا ہوا۔ جیسے زندوں کے درمیان مردہ۔"

دوبارہ غور کرو

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"مفضل! ابتداء میں جو باتیں میں نے تمہیں حاسوں (آنکھ، کان، زبان وغیرہ) کے بارے میں بتائیں اُن پر دوبارہ غور کرو کہ حواس کس طرح بنائے گئے، ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے کون سے اعضاء مقرر کیے۔ کس طرح اس حکیم خبیر نے ان حاسوں کے لئے کچھ چیزوں (مثلاً روشنی، ہوا، پانی) کو واسطہ قرار دیا۔ ان چیزوں کے ذریعے ہمارے حاسے اور حواس کام کرتے ہیں۔"

(مثلاً روشنی کے بغیر آنکھیں، ہوا کے بغیر کان اور پانی کے بغیر زبان مطلوبہ معلومات حاصل نہیں کر سکتی)

"تو مفضل! کیا ایک بے شعور مادّے اور بے عقل طبیعت (نیچر) میں یہ عالیشان قدرت وصلاحیت ہو سکتی ہے کہ وہ انسان کے جسم میں اس قدر باریک ولطیف مناسبتیں پیدا کرے اور جسم کے اس قدر حیران کن اعضاء بنائے اور ان اعضاء کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کرے۔ کوئی شخص جو عقل رکھتا ہو وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

تم سوچو کہ کیا یہ حیران کن انسانی جسم، اس کے اعضاء، ان کی نشو ونما، پھر ان اعضاء کی کارکردگی، ان اعضاء کے درمیان

ہم آہنگی، ان کا باہمی ربط، بغیر کسی خالق اور صانع اور ایک عالم و باخبر ذات یعنی اللہ رب العالمین کے علم وارادے اور ایک انتہائی طے شدہ منصوبے کے بغیر پیدا ہو گیا؟"

....

باب: 11

تمام مخلوقات کا ایک ہی خالق ہے

گزشتہ ابواب میں آپ نے ملاحظہ کیا کہ امام جعفر صادقؑ نے انسانی جسم، اس کے مختلف اعضاء، ان کی کارکردگی اور تمام اعضاء کے درمیان ایک دوسرے سے ہم آہنگی کو اثباتِ وجودِ خدا کے واضح دلائل کے طور پر بیان فرمایا۔ اعضاء کے درمیان ہم آہنگی پر غور کرنا ضروری ہے۔ اس بات کو ایک سرسری بات نہ سمجھیں۔ یہ ہم آہنگی، اعضاء کا ایک ٹیم کے طور پر کام کرنا، اللہ رب العالمین کی شان خلاقیت کو بھی ظاہر کرتا اور اس کی وحدانیت کو بھی۔

مثلاً آنکھیں باہر موجود اشیاء کا عکس، الیکٹریکل سگنلز کی مدد سے دماغ کو روانہ کرتی ہیں۔ دماغ اس سگنل کو ڈی کوڈ کر کے فیصلہ صادر کرتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے، اس کی ساخت، بناوٹ، سائز، اس کے فائدے، نقصان کیا ہیں۔ اب مثلاً دماغ، آنکھ، روشنی یا اشیاء میں سے کوئی ایک بھی شئے اگر کسی اور ''خالق'' کی بنائی ہوئی ہوتی تو آنکھ کے لئے ممکن نہیں تھا کہ وہ کسی بھی شے کو درست طور پر دیکھ سکے۔ دماغ کے لئے فیصلہ کرنا ممکن نہ ہوتا کہ یہ کیا شے ہے۔ اس طرح ہوتا تو ہمیں معلوم ہی نہ ہو پاتا کہ ہم سڑک دیکھ رہے ہیں یا کھیت، ہمیں جو شے دکھائی دے رہی ہے وہ گول ہے یا چوکور، یہ سودمند ہے یا نقصان دہ، یہ کھانے کی چیز ہے یا پینے کی۔

امام علیہ السلام نے فرمایا:

> ''مفضل! ذرا غور تو کرو، اس بات پر کہ یہ تمام اعضاء و جوارح اور عقل اور وہ تمام چیزیں جو انسانی وجود کے لئے ضروری ہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی موجود نہ ہوتی تو انسان کی زندگی کس قدر تکلیف دہ ہو جاتی۔''

(مثلاً جسم کے تمام اعضاء اور عقل موجود ہوتی لیکن اس کے جسم کا نظامِ توازن کام نہ کرتا تو ایسے انسان کی مشکلات کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ بہت سے لوگ جوابِ نارمل ہوتے ہیں اس کی ایک مثال ہیں)

عقل کا فائدہ

امام علیہ السلام نے مفضل بن عمرؓ سے گفتگو کرتے ہوئے جسم کے مختلف اعضاء کے ساتھ انھیں عقل کی اہمیت کی جانب بھی متوجہ فرمایا اس لیے کہ تمام اعضاء کی موجودگی کے باوجود اگر انسان کے پاس عقل نہ ہو تو وہ شخص جانوروں کی طرح ہوگا بلکہ ان سے بدتر۔ کیونکہ وہ شخص بہت سی ایسی چیزوں کو بھی نہیں سمجھ پائے گا جنہیں جانور سمجھتے اور جان سکتے ہیں (مثلاً غذا کی شناخت، اسے تلاش کرنا، اسی طرح دشمن کو پہچاننا اور خطرے سے بچنا)۔

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"مفضل! تم نے دیکھا کہ عام انسان کے جسم میں اس کی ضرورت کی تمام چیزیں، اعضاء اور صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں، کوئی چیز کوئی صلاحیت مفقود یا غائب نہیں ہوتی۔ تو کیا یہ سب باتیں، انسانی خلقت میں یہ اہتمام، یہ باریکیاں اور نزاکتیں (یہ حیران کن نادر و نایاب آلات، اعضاء) کیا یہ چیزیں بے علم و ارادہ پیدا ہو گئیں!"

(کیا ایک بے روح مادّہ ان اعضا کو خلق کر سکتا تھا)

نوٹ: عقلاً محال ہے

ایسا ہونا عقلاً محال ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کے ڈرائنگ روم میں رکھی ہوئی شیشے کی میز اچانک ہی خود اپنے اندر آنکھیں، ہاتھ پیر، ناک کان، حلق اور معدہ پیدا کر لے اور صوفے پر بیٹھ کر نیچے بچھے ہوئے قالین کو کھانا شروع کر دے اور پھر بڑھنا شروع ہو جائے اور پھر ایک اور چھوٹی میز کو پیدا کرے اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے۔

خارج از امکان بھی نہیں

اگر چہ عقلاً یہ سب کچھ محال ہے مگر ایسا ہونا خارج از امکان بھی نہیں ہے لیکن اس عمل کے وقوع پذیر ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ کے ارادے کی ضرورت ہوگی یا کسی ایسی ہستی کا ہونا ضروری ہوگا جسے اللہ تعالیٰ معجزہ رونما کرنے کی صلاحیت عطا فرمائے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا اژدھا بن کر سانپوں کو نگلنا اور دوبارہ عصا میں تبدیل ہو جانا، اللہ کے رسولؐ کے ہاتھوں پر کنکریوں کا کلمہ پڑھنا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بلانے پر مردہ پرندوں کے اجزاء کا دوبارہ زندہ پرندوں میں تبدیل ہو جانا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے "قم باذن اللہ" کہنے پر مُردوں کا زندہ ہو جانا، حضرت امیر المومنینؑ کے ایک جملہ ادا کرنے سے انسان کا کتے میں تبدیل ہو جانا اور پھر دوبارہ انسان بن جانا، حضرت امام علی نقیؑ کے ایک اشارے پر شیر قالین کا زندہ شیر میں تبدیل ہو کر ایک جادوگر کو نگل جانا...... یہ سب اللہ تعالیٰ کے علم، ارادے اور قدرت و طاقت کے نمونے ہیں اور ان سب افعال کے پیچھے ایک فاعل و قادر مطلق کی ذات موجود ہے۔

کئی افراد بعض اعضاء سے محروم کیوں؟

امام جعفر صادق علیہ السلام نے جسم کے اعضاء کے حوالے سے بات کی تو مفضل بن عمرؓ نے آپؑ سے سوال کیا۔ انہوں نے پوچھا: "آقا! یہ فرمایئے کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بعض افراد بعض اعضاء و جوارح سے محروم ہوتے ہیں اور ان کی زندگی میں وہی مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے؟"

امام جعفر صادق علیہ السلام نے جواب دیا۔

> "یہ اس شخص کی تنبیہ (یا امتحان) کے لئے ہے جس میں یہ (نقص) پایا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسا کچھ دوسروں (یعنی نارمل انسانوں) کی عبرت و نصیحت کے لئے (بھی) ہوتا ہے۔ جیسے

بادشاہ (حکمران یا حکومتیں) غلطیوں کی سزائیں مقرر کرتے ہیں اور ان سزاؤں کو برا بھی نہیں سمجھا جاتا بلکہ ان سزاؤں کی تعریف کی جاتی ہے۔ (انھیں دیکھ کر دوسرے لوگ عبرت پکڑتے ہیں)

اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جن لوگوں میں کوئی نقص جسمانی موجود ہو اور اس نقص کی وجہ سے ان کی زندگی سخت مشکلات کا شکار ہو جائے تو انہیں مرنے کے بعد اللہ رب کریم اس قدر ثواب عطا فرمائے گا کہ ان اعضاء کے نہ ہونے سے جو مصیبتیں دنیا میں ان پر پڑی تھیں، آخرت میں ان کے ثواب کو دیکھ کر وہ انہیں انتہائی حقیر معلوم ہوں گی۔ یہاں تک کہ اگر انہیں مرنے کے بعد دوبارہ انھی آزمائشوں سے گزرنے کا اختیار دیا جائے تو وہ اس بات کو بہ خوشی قبول کریں گے تا کہ زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کر سکیں"۔

نوٹ: نیچر، خالق حقیقی کی محتاج ہے

اس موضوع پر اپنے چوتھے لیکچر میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے تفصیل سے بات کی ہے۔ ہم اس لیکچر سے امام علیہ السلام کے چند کلمات یہاں درج کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"اب اگر وہ کہیں کہ اشیائے عالم (یعنی جانداروں) میں ایسا کیوں ہوتا ہے، بعض جاندار ناقص اور بعض بالکل صحیح و سالم کیوں

پیدا ہوتے ہیں؟ تو ایسے لوگوں کو یہ جواب دیا جائے گا کہ یہ اس لیے تا کہ انسان سمجھ سکے کہ کسی شے یا جاندار کا پیدا ہونا طبعیت (یعنی نیچر) کے سبب نہیں ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ خالق حکیم کے ارادے اور اس کی تقدیر (پروگرام) کے مطابق ایسا ہوا ہے۔ اس نے طبعیت (نیچر) کو ایسا بنایا ہے کہ معمولاً تو ایک طے شدہ قاعدے اور قانون پر عمل کرے اور کبھی کبھی اس قانون سے ہٹ بھی جائے تا کہ انسانوں کی سمجھ میں آ سکے کہ یہ طبعیت (یعنی نیچر) بھی دراصل کسی اور ذات کے تصرف میں ہے اور کسی چیز کو وجود میں لانے کے لیے خالق حقیقی کی قدرت کی محتاج ہے۔"

اس کلام کی تشریح چوتھے لیکچر میں پیش کی جائے گی۔

سر، ایک ہی کیوں پیدا کیا گیا؟

اب ہم امام علیہ السلام کے اس سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہیں۔

امام علیہ السلام نے فرمایا:

مفضل! اب ذرا غور کرو ان اعضاء میں جو ایک ایک یا دو، دو پیدا کیے گئے اور اللہ تعالیٰ کی ان حکمتوں اور مصلحتوں پر توجہ مبذول کرو کہ اللہ نے کچھ اعضاء کو ایک، کچھ کو دو اور کچھ کو اس سے زیادہ پیدا کیا۔ آخر اس میں کیا فوائد ہیں؟

(مثلاً گردن، سر، دل، دماغ، زبان، معدہ، جگر، مثانہ ایک ایک پیدا کیے گئے۔ ہاتھ، پیر، کان، آنکھیں، گردے اللہ نے دو دو عطا کیے، ہاتھوں

پیروں کی انگلیاں پانچ پانچ پیدا کیں، جبکہ دانتوں کی تعداد 32 ہے)

امام علیہ السلام نے فرمایا:

''مفضل! ذرا سر ہی کو دیکھو۔ یہ ان اعضاء میں سے ہے جو ایک ہی پیدا کیا گیا۔ کسی انسان کے لئے مناسب نہیں تھا کہ اس کی گردن پر ایک کی بجائے 2 سر ہوتے اس لئے کہ 2 سروں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اگر انسان کی گردن پر 2 سر لگا دیے جاتے تو پھر یہ اضافی سر ایک بوجھ بن جاتا۔ جبکہ دوسرے سر کی ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ وہ تمام حاسّے (محسوس کرنے کے ذرائع) جن کی کسی انسان کو ضرورت ہوتی ہے وہ سب کے سب ایک ہی سر میں موجود ہیں۔

نوٹ: دماغ کے اندر اطلاعاتی مراکز

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں، کانوں سے سنتے ہیں، زبان سے چکھتے ہیں، ناک سے سونگھتے ہیں، جلد کے ذریعے محسوس کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ آنکھوں، کانوں، زبان، ناک اور جلد کا کام بیرونی دنیا سے معلومات جمع کر کے انہیں برقی کیمیائی سگنلز میں تبدیل کر کے دماغ تک پہنچانا ہے۔ ان معلومات کی بنیاد پر دماغ خود دیکھتا، سنتا، چکھتا، سونگھتا اور محسوس کرتا ہے اور اس مقصد کے لئے دماغ کے اندر الگ الگ مراکز موجود ہیں جو اس سارے کام کو پروسس کرتے یا سرانجام دیتے ہیں۔

اسی طرح ہاتھ پیروں یا جسم کے مختلف اعضاء کی حرکات بھی دماغ کے حکم کی پابند ہوتی ہیں اور اس مقصد کے لئے بھی دماغ میں الگ الگ مقام پر حرکات کو کنٹرول کرنے والے مراکز

موجود ہیں۔ یہ سب باتیں ماہرین حیاتیات نے اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں معلوم کیں جب کہ امامؑ نے جسم و دماغ کے بارے میں یہ حیران کن انکشافات ساتویں صدی عیسوی کے دوران فرمائے کہ انسان کو جن حاسوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سر (یعنی دماغ) کے اندر موجود ہوتے ہیں۔

اگر 2 سر ہوتے؟

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"اگر انسان کے ایک کی بجائے 2 سر ہوتے تو ایک آدمی کے دو حصے ہو جاتے (یعنی وہ دو شخصیتوں میں بٹ جاتا)۔

2 سروں (یعنی دو دماغوں) کی موجودگی میں اگر وہ ایک سر (دماغ) سے گفتگو کرتا (یا عمل اور ردعمل کا اظہار کرتا) تو دوسرا فالتو سمجھا جاتا۔ اور اگر وہ دونوں سروں (یعنی دماغوں) سے کام لیتا تو یہ ایک فضول سی بات ہوتی اور اگر وہ ایک سر (یعنی دماغ) سے ایک بات کرتا اور دوسرے سے دوسری بات کرتا تو سننے والا سمجھ نہ پاتا کہ کون سی بات صحیح ہے اور کون سی غلط۔ کس بات پر اعتبار کیا جائے اور کسے نظر انداز کر دیا جائے"۔

(پھر یہ بھی ہوتا کہ ایک دماغ جسم کو کچھ حکم دیتا اور دوسرا دماغ اس کے برعکس حکم دیتا تو انسانی اعضاء و جوارح، رگیں اور پٹھے آخر کار مفلوج ہو کر رہ جاتے۔)

ہاتھ دو کیوں بنائے گئے؟

ہاتھوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے انسان کو صنعت و حرفت اور کھیتی باڑی کرنے، اپنے خیالات

کوقلم بند کرنے، اپنے تصورات کومختلف صورتوں میں عملی شکل دینے کی صلاحیت عطا کی ہے۔اسی لئے ہاتھوں کے بارے میں امام جعفرصادق علیہ السلام نے فرمایا:

"مفضل! دیکھو، اگر انسان کو کام کرنے کے لئے صرف ایک ہاتھ دیا جاتا تو ہرگز مناسب نہ ہوتا۔اس سے انسان کے ان کاموں میں خلل پیدا ہوتا جنہیں وہ دو ہاتھوں سے سرانجام دیتا ہے اور جن کاموں کا کرنا ناگزیر ہے۔مثلاً اگر کسی بڑھئی کا ایک ہاتھ مفلوج ہو جائے تو کس طرح اپنا کام سرانجام دے سکتا ہے۔"

حنجرہ Larynx کیوں پیدا کیا گیا؟

اردو لغت کے مطابق لفظ حنجرہ کا ترجمہ نرخرہ، حلق اور ٹیٹوا کیا گیا ہے لیکن علم فعلیات (فزیالوجی) کے مطابق حنجرہ (Larynx) حلق میں موجود اس نالی کو کہا جاتا ہے جو بولتے اور نگلتے وقت ہوا اور غذا کے نوالے یا پانی کے گھونٹ کو انتہائی نفاست کے ساتھ درست سمت میں روانہ کرتی ہے یعنی غذا یا پانی کو معدے کی نالی (Esophagus) کی طرف اور ہوا کو سانس کی نالی (Trachea) کی جانب۔

امام علیہ السلام نے فرمایا:

حنجرہ (Larynx) اس لئے بنایا گیا تاکہ اس کے ذریعے لطیف ہوا (یعنی گرد و غبار اور جراثیم سے پاک تازہ اور مرطوب ہوا) پھیپھڑوں تک پہنچ سکے اور دل کو متواتر اور پے در پے آنے والی سانس سے آرام دے۔

آواز اور اس کے آلات

امام علیہ السلام نے فرمایا:

''مفضل! ذرا انسان کی آواز، اس کی گفتگو، حروف و الفاظ اور جملوں کے منہ سے نکلنے اور اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو آلات دیئے ہیں ان پر غور کرو۔ دیکھو حنجرہ (Larynx) تو ایک نلکی (یا نالی) جیسا ہے جس سے آواز نکلتی ہے۔ زبان، دانت، ہونٹ اور (ناک) ہوا کو حروف و الفاظ میں ڈھالنے کا سانچا ہیں۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جس شخص کے دانت گر جاتے ہیں تو وہ حرف ''س'' ادا نہیں کر پاتا اور جس کے ہونٹ کٹ جائیں تو وہ حرف ''ف'' ادا نہیں کر سکتا اور جس کی زبان موٹی ہو اس کے لئے حرف ''ر'' کو ادا کرنا مشکل ہوتا ہے۔

تو دیکھو! کہ حنجرہ تو بانسری سے مشابہ ہے اور پھیپھڑے لوہار کی دھونکنی جیسے ہیں اور پھیپھڑوں کو دبانے (کنٹرول کرنے) والے پٹھے بین بجانے والے کی انگلیوں کی طرح ہیں۔ دھونکنی یعنی پھیپھڑے پچکتے ہیں تو ان سے ہوا باہر نکلتی ہے۔ پھر زبان، ہونٹ اور دانت (اور ناک) اس ہوا کو حروف والفاظ یا راگ کی شکل دیتے ہیں۔ یہ ان انگلیوں کی طرح ہیں جو بانسری کے مختلف سوراخوں کو ایک خاص ترتیب سے کھولتی

اور بند کرتی رہتی ہیں۔"

امام علیہ السلام نے آج سے کم وبیش ساڑھے تیرہ سو سال پہلے تشابہات کے ذریعے بولنے کے حیران کن عمل کے بارے میں جو کچھ فرمایا اس کی تشریح انشاءاللہ اگلے باب میں جدید میڈیکل سائنس اور فزیالوجی کی مدد سے بیان کریں گے تاکہ قارئین سمجھ سکیں کہ امامؑ نے مثالوں کے ذریعے جو بات سمجھائی ہے وہ ایک حیران کن سائنسی حقیقت ہے۔اس حوالے سے امامؑ کے دور سے صدیوں پہلے اور صدیوں بعد بھی اس کرۂ ارض پر عام انسان کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

باب: 12

امام جعفر صادق علیہ السلام کا دور......اور جدید سائنسی زمانہ

یورپ کے سائنسدانوں نے انسانی جسم کی ساخت اور کارکردگی کے بارے میں معلومات پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں حاصل کرنا شروع کیں۔اس زمانے میں یورپ کے میڈیکل کالجز میں عربی زبان میں تعلیم دی جاتی تھی اور تعلیمی اداروں میں ان مسلمان فلاسفرز کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں جو امام جعفر صادق علیہ السلام کے کئی صدی بعد پیدا ہوئے تھے۔

اٹلی کے نامور مصور اور سائنسدان لیونارڈو ڈاونسی (Leonardo Davinci) اور بیلجیم کے نامور ڈاکٹر اندریس ویسالیس (Andreas Vesalius) نے 15ویں اور 16ویں صدی عیسوی کے زمانے میں اپنے تجربات کے دوران سینکڑوں لاشوں کے پوسٹ مارٹم کیے اور اعضاء کی کارکردگی و ساخت کو جاننے کے ساتھ ساتھ ان کی تصاویر بھی بنائیں۔ 1543 عیسوی میں ڈاکٹر اندریس ویسالیس نے اناٹومی پر پہلی کتاب لکھی جس کا نام تھا ''دی اسٹرکچر آف دی ہیومن باڈی''۔ جسمِ انسانی کے اعضاء اور ان اعضاء کے درمیان باہمی ربط اور کارکردگی کا تفصیلی معائنہ آتشی شیشے، سادہ خردبین اور پھر 1930ء میں الیکٹران خردبین کی ایجاد کے بعد ہی ممکن ہوسکا۔

اس باب میں آپ امام علیہ السلام کے ان ارشادات کی سائنسی تشریح ملاحظہ کریں گے جنھیں آپ نے گزشتہ باب میں پڑھنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

نوٹ: انسان، آواز اور گفتگو کے آلات

بولنا یا گفتگو کرنا ہمارے لیے ایک عام سی بات ہے لیکن ہم تصور ہی نہیں کرسکتے کہ بولنے اور سننے کے عمل میں ہمارے جسم کے کتنے خلیے، اعضاء، صلاحیتیں کام کرتی ہیں اور کس قدر توانائی خرچ

ہوتی ہے اور یہ توانائی کہاں سے آتی ہے؟

ذرا غور فرمائیں کہ پھونک مارنے اور سانس خارج کرنے میں بھی ہوا پھیپھڑوں سے نکلتی ہے اور منہ یا ناک سے خارج ہوتی ہے لیکن یہی ہوا جب ہمارے ارادے کے تابع ہوتی ہے تو بامعنی لفظ، بامقصد جملہ، متاثر کن تقریر یا ایک نشاط انگیز گیت کس طرح بن جاتی ہے؟

امام علیہ السلام نے اپنے زمانے کی مجبوریوں (یعنی علمِ انسانی کی کم مائیگی) کے سبب اپنی بات سمجھانے کے لیے تشابہات کے سہارے بولنے کے حیران کن عمل کو ہمارے لیے بیان فرمایا۔ آیئے اب ہم امام علیہ السلام کے اس کلام کو فزیالوجی اور اینا ٹومی کی مدد سے بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ ہمارے قارئین اللہ تعالیٰ کی شانِ خالقیت اور اس کے انعام و اکرام اور علم امامت کا کسی قدر اندازہ کر سکیں۔

حلق......ایک عظیم نعمت

آپ صبح اٹھ کر اپنے والدین کو السلام علیکم یا اپنے بچوں کو "وعلیکم السلام" کہتے ہیں تو آپ اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ ان لفظوں کی ادائیگی میں جسم کے کتنے کھرب خلیے، غدود، اعضاء، رگیں اور پٹھے حصہ لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان الفاظ کی ادائیگی کے دوران جسم کے اندر کس قدر الیکٹریکل، مکینیکل اور برقی کیمیائی سرگرمیاں رونما ہوتی ہیں جن کے ذریعے آپ اس قابل ہوتے ہیں کہ پھیپھڑوں میں موجود ہوا، ایک انتہائی پراسرار و پیچیدہ عمل سے گزر کر بامعنی الفاظ کی شکل اختیار کر سکے۔

بولنے یا گفتگو کرنے کے یہ حیران کن معجزے ہمارے حلق کے اندر رونما ہوتے ہیں۔ حلق ہمارے پیدا کرنے والے کا انوکھا اور عقل کو ششدر کر دینے والا ایک عظیم شاہکار، ایک بیش بہا نعمت ہے۔ عام لوگ حلق کو ایک پائپ کا ٹکڑا سمجھتے ہیں جس کے ذریعے کھانا، پانی ان کے پیٹ میں جاتا ہے، لیکن بات اتنی سادہ نہیں ہے۔

حلق کے اندر ذرائع نقل و حمل کا ایک بہت عظیم الشان نظام کام کرتا ہے جو واضح طور پر کھلنے اور بند ہونے والے، سکڑنے اور پھیلنے والے، ایسے آلات سے مکمل طور پر لیس ہے جو ہر قسم کی

ٹنوں غذا، لاکھوں کیوبک فٹ ہوا، منوں پانی، ٹھوس، سیال، سخت، نرم اور گرم چیزوں کو انتہائی ذمے داری، نفاست اور حفاظت کے ساتھ آپ کے معدے یا پھیپھڑوں تک پہنچانے کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں کے حامل ہیں۔

حلق کے اندر موجود قدرت کی اعلیٰ ترین انجینئرنگ کے یہ نادر و نایاب آلات و اعضاء نہ ہوتے تو غذا کا کوئی نوالہ، پانی کا کوئی گھونٹ اور زندہ رہنے کے لیے ایک سانس بھی جسم کے اندر نہ پہنچ پاتی۔ حلق کے ان آلات کی کارکردگی میں معمولی سی بھول چوک یا ذرا سی غلطی بھی اکثر جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔

ہم اور آپ زندگی میں کروڑوں نوالے نگلتے ہیں، کھربوں گھونٹ پانی کے پیتے ہیں اور بے شمار مرتبہ سانس لیتے، نکالتے اور اربوں کھربوں لفظ بولتے ہیں لیکن ہمارے حلق کے یہ نادر و نایاب آلات ہر مرتبہ یہ کام انتہائی نفاست اور نپے تلے انداز میں سرانجام دیتے ہیں۔

ماہرین کہتے ہیں کہ ہر بار نوالہ نگلتے اور پانی پیتے وقت اس نظام کی کارکردگی ہی یہ طے کرتی ہے کہ انسان کو مزید زندہ رہنا ہے یا اس نوالے یا پانی کے اس گھونٹ کو استعمال کرنے کی کوشش میں اسے زندگی سے ہاتھ دھولینا ہیں۔ (حوالہ: جسم کے عجائبات)

حلق کی حیران کن بناوٹ

آیئے دیکھتے ہیں کہ حلق ہے کیا؟

آپ کی گردن کا مختصر سا علاقہ بے شمار اعصاب، خون کی نالیوں، ریڑھ کی ہڈی کے مُہروں، دوسرے کئی آلات وتنصیبات اور خود حلق کی نالیوں کی وجہ سے زبردست "ٹریفک جام" کا منظر پیش کرتا ہے۔

حلق کی پہلی نالی فیرینکس (Phyarynx) ہے۔ اس کی شکل کسی قیف سے ملتی جلتی ہے یعنی اوپر سے چوڑی اور نیچے بتدریج پتلی ہوتی ہوئی۔ یہ پانچ انچ لمبی ہے اور آپ کی ناک کے پیچھے سے شروع ہوکر آپ کے نرخرے کی ہڈی تک آتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی حلق کی دوسری نالی ہے۔ اسے لیرینکس (Larynx) کہا جاتا ہے۔ اردو میں اسے حنجرہ کہتے ہیں۔ یہ نالی بے حد

اہم جگہ واقع ہے۔ بولنے اور کھانے کی صورت میں ہوا اور غذا کو یہی نالی درست سمت میں روانہ کرتی ہے۔ یعنی غذا کو معدے کی طرف اور ہوا کو پھیپھڑوں کی جانب۔

یہی وہ نادر و نایاب آلہ ہے جو بولنے کے نظام میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کی شکل کرکٹ کے بیٹ جیسی ہے۔ یہ نالی نو عدد گول اور نرم ہڈیوں کا مجموعہ ہے اور پونے دو انچ کے قریب لمبی ہے۔ گول دائروں کی شکل والی یہ نرم ہڈیاں رطوبت جیسی جھلی میں پیک ہوتی ہیں اور پٹی کی شکل کی مضبوط جھلی (Lagaments) کے ذریعے ایک دوسرے سے جڑی رہتی ہیں۔

لیرینکس کے نیچے دو مزید نالیاں ہیں۔ ایسوفیگس (Esophagus) نامی نالی سیدھی معدے میں جاتی ہے۔ یہ غذا کی گزرگاہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی سانس کی نالی ہے۔ اسے ٹریچیا (Trachea) کہا جاتا ہے۔ یہ نالی پھیپھڑوں میں جا کر کھلتی ہے۔ یہ دونوں تقریباً ایک انچ قطر کی ہوتی ہیں۔ (اقتباس: I am Geo's Body)

آواز و الفاظ کس طرح پیدا ہوتے ہیں

بولنے یا پھیپھڑوں سے نکلنے والی ہوا کو بامعنی الفاظ میں تبدیل کرنے والے آلات بھی حلق ہی میں پائے جاتے ہیں انہیں ووکل کورڈز (Vocal Cords) کہا جاتا ہے۔ پھیپھڑوں سے نکلنے والی ہوا، ان کے ذریعے حلق ہی سے آواز میں تبدیل ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہ ووکل کورڈز ہمارے ہونٹوں جیسے ہوتے ہیں۔ سفیدی مائل اور چمک دار۔ ان ووکل کورڈز کو پٹھوں کا ایک انتہائی پیچیدہ نظام کنٹرول کرتا ہے۔

جب یہ کھلتے ہیں تو آپ کے حلق سے مدہم اور گہری آواز نکلتی ہے۔ جب یہ سکڑتے ہیں تو آپ کی آواز پتلی اونچی اور تیز ہو جاتی ہے۔ اور جب آپ کچھ نگل رہے ہوتے ہیں تو ووکل کورڈز بالکل بند ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے نگلتے وقت کچھ بولنا ممکن نہیں ہوتا۔ حلق کے نظام سے کبھی کوئی لمحے بھر کی بھول چوک ہو جائے تو بات دوسری ہے۔ آواز تو اس وقت بھی نہیں نکلتی لیکن جان نکل جانے کا امکان ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اسلامی احکامات کے مطابق کھانا کھانے کے

دوران گفتگو کرنے کو منع کیا گیا ہے۔

حلق میں موجود یہ ووکل کورڈز سانس کی نالی سے ہونٹوں تک سات انچ کے علاقے میں موجود ہوتے ہیں اور کسی پائپ نما باجے (بین یا بانسری) کی طرح کام کرتے ہیں۔ جب آپ بولنے کا ارادہ کرتے ہیں تو پھیپڑوں کو کنٹرول کرنے والے پٹھے پھیپھڑوں کو دباتے ہیں۔ پھیپھڑوں سے نکلنے والی ہوا حلق کی جانب آتی ہے اور ووکل کورڈز سے گزر کر منہ میں داخل ہوتی ہے۔

اس مرحلے پر یہ نامکمل اور ناقص آواز ہوتی ہے۔ منہ کے اندر آنے کے بعد زبان، ہونٹ، تالو اور ناک اس خام یا ناقص آواز کو مکمل اور بامعنی آواز والفاظ میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

حیران کن بات یہ ہے کہ یہ سارے الیکٹریکل، مکینکل اور برقی کیمیائی کام سیکنڈوں میں مکمل ہو جاتے ہیں۔ آپ تصور فرمائیں کہ آپ دن میں کتنی بار بولتے ہیں یا مقررین کس رفتار سے ہوا کو بامعنی الفاظ میں تبدیل کر رہے ہوتے ہیں، بغیر کسی تکلیف، بغیر کسی مشقت اور بغیر کسی معاوضے کی ادائیگی کے۔ (اقتباس: I am Geo's Body)

(امام علیہ السلام کی جانب سے اس سوال کی سرسری سی تشریح آپ نے ملاحظہ کی جو امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل ابن عمرؓ سے پوچھا کہ حنجرہ (حلق، نرخرہ یا لیرینکس) کیوں پیدا کیا گیا؟ پھر امامؑ نے خود ہی اس سوال کا جواب اس زمانے کے لوگوں کی ذہنی سطح اور معلومات کے پیش نظر مختصر اور مثالوں کے ساتھ بیان فرمایا۔ بہتر ہوگا کہ آپ گزشتہ باب کے آخری حصے کا دوبارہ مطالعہ فرمائیں)

زبان کے فائدے

اس کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل ابن عمرؓ کو دیگر اعضائے جسمانی اور ان کی ضرورت و مصلحت کی جانب متوجہ فرمایا:

مفضل! "دیکھو! زبان اس لیے پیدا کی گئی کہ وہ کھانوں کا

ذائقہ معلوم کر سکے۔ ہر ذائقے کو الگ الگ محسوس کر سکے۔ میٹھے
کو کھٹے سے اور نمکین کو شیریں سے الگ پہچان سکے۔ زبان کا
ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ اس سے کھانا پینا خوشگوار معلوم ہونے
میں مدد ملتی ہے''۔

نوٹ: زبان کیا ہے؟

زبان دراصل ایک خاص طرح کی کھال ہے جو پروٹین ہی سے بنی ہے۔ یعنی یہ گوشت ہی کا ایک ٹکڑا ہے۔ جس طرح کی کھال سے یہ بنی ہے اسے میوکس ممبرین کہا جاتا ہے۔ میوکس ممبرین، کھال یا جلد کی وہ قسم ہے جو منہ، زبان، ناک اور غذا کی اندرونی نالیوں پر پائی جاتی ہے۔ زبان ظاہراً گوشت کا ٹکڑا ہے لیکن اس کے اندر پٹھوں اور نازک اعصاب کا ایک انتہائی پیچیدہ نظام کام کرتا ہے۔ زبان کو آپ ہاتھ لگا کر دیکھیں تو اس کی سطح آپ کو کھردری محسوس ہوگی۔ یہ ایک خاص انداز سے نرم اور کھردری ہے اور اسی وجہ سے یہ غذا کو آسانی کے ساتھ اٹھا کر حلق تک پہنچاتی ہے۔

ذائقوں کو محسوس کرنے والے ابھار (Taste Buds) بھی اسی کھردری سطح پر پائے جاتے ہیں۔ ان ابھاروں میں وہ خلیے ہوتے ہیں جو غذا کے ذائقے کو محسوس کر کے ذائقے کی تفصیلات دماغ کے مخصوص حصے تک پہنچاتے ہیں۔

یہ ابھار بے شمار، لاتعداد ذائقوں کو دراصل ایک کیمیائی عمل کے ذریعے شناخت کرتے ہیں۔ یہ ابھار زبان کی سطح ہی پر نہیں، اس کے نچلے حصے اور تالو میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ماہرینِ حیاتیات کا خیال ہے کہ زبان اور تالو کے مختلف حصے کڑوے، میٹھے، نمکین اور کھٹے، جیسے چار بنیادی ذائقوں کی شناخت کرتے ہیں۔ ہمارے کھانوں میں ان بنیادی ذائقوں کے امتزاج سے سینکڑوں ہزاروں ذائقے بنتے ہیں۔ (ان چار ذائقوں کے بارے میں امامؑ کا کلام آپ پڑھ چکے ہیں)۔

منہ اور زبان میں موجود ذائقہ محسوس کرنے والے ابھاران چار بنیادی ذائقوں اور ان کے امتزاج سے بننے والے ہر ذائقے کے بارے میں تفصیلات دماغ کو روانہ کرتے ہیں اور دماغ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ ذائقہ کیسا ہے۔

غذائیں جب دانتوں اور داڑھوں کے ذریعے پسنے اور لعابِ دہن کے ساتھ مل کر رقیق شکل اختیار کرتی ہیں تو ان کے مختلف اجزاء زبان، تالو اور منہ کے دوسرے مقامات پر موجود مختلف حساس ابھاروں کو متحرک کر دیتے ہیں۔ ان مخصوص حساس ابھاروں سے ایک بہت مدہم برقی رو پیدا ہوتی ہے اور بے حد حساس اعصاب سے گزر کر دماغ کے مخصوص حصے میں سرایت کرتی رہتی ہے۔ دماغ کا یہ حصہ ان برقی سگنلز کو ڈی کوڈ کرتا جاتا ہے اور آپ کو معلوم ہوتا رہتا ہے کہ غذا کا ذائقہ کیسا ہے۔

ذائقہ محسوس کرنے کی یہ صلاحیت ہی ہے جس کی وجہ سے انسان غذا استعمال کرتا ہے۔ اگر غذا استعمال کرنے اور پانی پینے میں ہمیں لذت و ذائقہ محسوس نہ ہو تو ہمارے لیے کھانا پینا ایک عذاب بن کر رہ جائے۔

زبان کی ایک بیماری جسے ڈاکٹرز Dysgeusia کہتے ہیں' اس میں زبان کا مزہ خراب ہو جاتا ہے؛ مٹھاس بری لگنے لگتی ہے۔ گوشت دیکھنے کو دل نہیں کرتا۔ ثانی نمکین محسوس ہوتی ہے۔ زبان کی اور ایک بیماری Hypogeusia کہلاتی ہے۔ اس بیماری میں چکن روسٹ نرم ربڑ کی طرح محسوس ہوتا ہے اور اسے منہ میں لینے سے ابکائی آنے لگتی ہے۔ مٹھاس کم محسوس ہوتی ہے۔ اس بیماری کی انتہائی شکل میں ذائقے اور کھانے پینے کے مزے مکمل طور پر ختم ہو جاتے ہیں اور انسان شدید مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ (اقتباس: جسم کے عجائبات)

یہ ہے زبان اور ذائقوں کی کسی قدر تفصیل جس کے بارے میں امام علیہ السلام نے مفضل ابن عمر کو مختصر الفاظ میں آگاہ فرمایا تھا۔

باب: 13

دانت، ہونٹ اور آنکھیں

گزشتہ باب میں ہم نے امام علیہ السلام کے ان ارشادات کی کسی قدر تشریح پیش کی تھی جن میں امام علیہ السلام نے زبان اور بولنے کے آلات مثلاً حلق، منہ اور زبان وغیرہ کے بارے میں بتایا تھا۔ زیرِ نظر باب میں ہم دانتوں، ہونٹ اور آنکھوں کے بارے میں امام علیہ السلام کی مزید گفتگو پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

دانتوں کے فائدے

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"مفضل دیکھو! دانت (اور داڑھیں) غذا کو چباتے ہیں تاکہ وہ نرم ہو جائے اور اس کا ہضم ہونا آسان ہو جائے۔ اس کے علاوہ دانت اس لئے بھی پیدا کیے گئے کہ وہ ہونٹوں کو سہارا دیں کہ وہ اندر کی طرف نہ چلے جائیں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ جن لوگوں کے دانت گر جائیں تو ان کے ہونٹ ڈھیلے ہو کر اندر کو چلے جاتے ہیں۔" (مطلب یہ کہ دانت اور ہونٹ مل کر چہرے کو ایک خاص طرح کا حُسن اور تناسب عطا کرتے ہیں۔)

منہ کے دروازے

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"ہونٹوں کے بہت سے فائدے ہیں۔ ہونٹوں کی مدد سے

انسان پانی کو گھونٹ گھونٹ کر کے پی سکتا ہے۔ پانی کو کچھ دیر کے لئے منہ میں رکھ سکتا ہے۔ اگر ہونٹ نہ ہوتے تو پانی کو براہِ راست منہ میں ڈالنا پڑتا۔ اس طرح پانی حلق کے اندر بغیر کسی اندازے کے جاتا اور اس سے گلے میں پھندا لگنے کا خطرہ موجود رہتا۔

پھر یہ ہونٹ منہ کے لئے ایک دروازے کی طرح (بھی) ہیں کہ انسان جب چاہے اس دروازے کو کھولے اور جب چاہے بند کرلے۔ اگر ہونٹ نہ ہوتے اور صرف دانت ہوتے تو انسانی چہرہ کس قدر بدنما دکھائی دیتا؟''

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

''دیکھو مفضل! میں نے تم سے جن اعضاء کا ذکر کیا، ان میں ہر ایک کے کئی کئی فائدے ہیں اور یہ کئی کئی کاموں میں انسان کو مدد فراہم کرتے ہیں۔ جیسے ہتھوڑی، جس سے کیل بھی ٹھونکی جا سکتی ہے اور لوہے کو کوئی شکل بھی دی جا سکتی ہے۔''

(مثلاً ناک سونگھنے کا کام بھی کرتی اور سانسوں کو جراثیم سے صاف کرنے اور اسے پھیپھڑوں کے لیے قابل استعمال بنانے کا کام بھی۔ اسی طرح زبان ذائقوں سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ بولنے اور غذا کو حلق تک پہنچانے کا فریضہ بھی سرانجام دیتی ہے)۔

نوٹ: منہ اور جراثیم

ہونٹوں کی وجہ سے انسان اپنا منہ کھول یا بند کر سکتا ہے۔ اگر منہ کھلا ہی رہا کرتا تو گردوغبار، حشرات مثلاً چیونٹیاں، مچھر اور دوسرے کیڑے مکوڑے منہ گھس جایا کرتے۔ اسی طرح فضا میں

موجود بے شمار جراثیم اور دھوئیں کے ذرات منہ میں اپنی جگہ بنا لیتے۔

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ناک اور کانوں کے سوراخ بھی تو کھلے ہوئے ہیں۔ ان میں ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ کیڑے مکوڑے یا جراثیم وہاں گھس جائیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کانوں اور ناک کے اندر اللہ نے بہت سے دوسرے حفاظتی انتظامات کیے ہیں مثلاً ناک کے نظر آنے والے (مائکرو اسکوپک) بال اور ایک چپ چپی رطوبت' یہ سب مل کر گرد و غبار اور جراثیم کو سانس کی نالی تک پہنچنے سے پہلے ہی پکڑ کر ہلاک کر دیتے ہیں۔

اسی طرح کانوں کا معاملہ ہے۔ کانوں کی بناوٹ اندر سے بھول بھلیوں کی طرح ہے اور وہاں بھی ایک زہریلی رطوبت موجود رہتی ہے جس کے سبب حشرات یا جراثیم اندرونی کان تک نہیں پہنچ پاتے۔ آنکھیں بھی کھلی رہتی ہیں۔ ان کے حفاظتی اقدامات کے بارے میں آپ آگے پڑھیں گے۔

آنکھوں کے پپوٹے اور پلکیں

"مفضل! ذرا آنکھوں کے پپوٹوں پر غور کرو کہ یہ کس طرح آنکھ کے پردے یا غلاف کی طرح بنائے گئے اور آنکھوں کی پلکیں ان ڈوریوں کی طرح ہیں جنہیں پکڑ کر پردوں کو اٹھایا اور چھوڑا جاتا ہے۔ آنکھ کو (جو ایک انتہائی نازک عضو ہے) اللہ تعالیٰ نے کس طرح چہرے پر موجود گڑھوں میں رکھا اور پھر انہیں پپوٹوں کے ذریعے (ایک کھلنے اور بند ہونے والے) غلاف کے اندر محفوظ کیا اور ان کے اوپر پلکوں کے بالوں سے سایہ کر دیا۔"

نوٹ: آنکھوں کے عجائبات

آنکھ بہ ظاہر پنگ پانگ کی ایک گیند کی طرح نظر آتی ہے جس کے درمیان میں سیاہ رنگ کر

دیا گیا ہو۔ آنکھ کی بیشتر نازک تنصیبات اسی سیاہ رنگ والے علاقے میں پائی جاتی ہیں۔ اس میں سامنے کی طرف قرنیہ (Cornea) کا نیم بیضوی کور ہے۔ اس کے عقب میں آنکھ کی پتلی (Pupil) ہے۔ دیکھنے کے عمل کا آغاز اسی جگہ سے ہوتا ہے۔ قرنیہ روشنی کی لہروں کو مخصوص زاویوں سے موڑتا ہے اور انہیں آنکھ کی پتلی تک پہنچاتا ہے۔ آنکھ کی پتلی ایک دریچے کی طرح ہے جو خود بہ خود سکڑتی اور پھیلتی رہتی ہے۔ تیز دھوپ میں یہ آخری حد تک سکڑ جاتی ہے اور رات کی تاریکی میں پوری طرح کھل جاتی ہے۔

آنکھ کا عدسہ (Lense) بھی قدرت کے عجائبات میں سے ایک عجوبہ ہے۔ یہ عدسہ وٹامن کی کسی بیضوی گولی کی طرح ہے اور ہر وقت ایک سیال مادے سے بھرا رہتا ہے۔ اس کے چاروں طرف ناقابل تصور حد تک چھوٹے لیکن بے حد مضبوط پٹھے (Muscles) موجود ہیں۔ جب یہ پٹھے سکڑتے ہیں تو آپ قریب کی چیزوں کو واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں اور جب یہ پٹھے پھیلتے ہیں تو آپ دور دراز کی اشیاء کو بہ آسانی دیکھ لیتے ہیں۔

آنکھ کے یہ حساس، نازک لیکن انتہائی مضبوط پٹھے دن میں کتنی مرتبہ سکڑتے اور پھیلتے ہیں، اس کا اندازہ آپ اس طرح کر سکتے ہیں کہ آپ کی آنکھیں ایک عام دن میں کم از کم ایک لاکھ مرتبہ سکڑتی اور پھیلتی ہیں تاکہ آپ بار بار قریب اور دور کی چیزوں کو بہ آسانی دیکھ سکیں۔ اس کا مطلب ہے کہ آنکھ کی پتلی کو کنٹرول کرنے والے یہ پٹھے ہر روز کم از کم ایک لاکھ مرتبہ سکڑتے ہیں اور ایک لاکھ مرتبہ پھیلتے ہیں۔

عدسے کے سامنے اور اس کے پیچھے سیال مادّے سے بھرے ہوئے دو حصے ہیں۔ سامنے والا حصہ پانی جیسے شفاف مادّے سے بھرا رہتا ہے جب کہ پیچھے والا حصہ انڈے کی سفیدی جیسے شفاف اور سیال مادّے سے پُر رہتا ہے۔ یہ دونوں مادّے انتہائی شفاف ہوتے ہیں تاکہ کسی بھی مرحلے میں اندر آنے والی روشنی کی لہروں کے راستے میں ذرّہ برابر بھی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔

(حوالہ: How Body Works)

خطرات اور ان کا تدارک

آنکھیں ہمارے چہرے پر سامنے کی طرف ہیں اور ہر وقت یہ گرد و غبار، دھویں کے ذرات اور فضا میں تیرتے ہوئے جراثیم کی زد میں رہتی ہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کی حفاظت اور صفائی کے لیے ایک خودکار نظام پیدا کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے آنکھوں کے اوپر دو غدود موجود ہیں انہیں لیکریمل گلینڈز (Lacrimal Glands) کہا جاتا ہے۔

یہ دونوں غدود ایک جراثیم کش رطوبت ہر وقت تیار کرتے اور اسے آنکھوں پر پھیلاتے رہتے ہیں۔ یہ دونوں غدود آنسوؤں کے قدرتی سرچشمے ہیں۔ یہ جراثیم کش رطوبت ہر وقت آنکھوں پر پھیلی رہتی ہے اور آنکھ کی بیرونی سطح سے ٹکرانے والی باریک گرد اور دھوئیں کے اجزاء کو آنکھ پر سے ہٹاتی رہتی ہے۔ مہلک جراثیم اس رطوبت میں چپک کر ہلاک ہوتے رہتے ہیں۔

اس کام میں آنکھوں کی پلکیں اور پپوٹے بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ آپ ہر منٹ میں تین سے چار مرتبہ پلکیں جھپکتے ہیں۔ تھکن کی صورت میں یہ تعداد بڑھ جاتی ہے۔ پلکیں جھپکنے کے اس عمل میں آپ کے پپوٹے کار کے وائپرز کی طرح آپ کی آنکھ اور اس کے قرنیے (Cornea) کو ہر منٹ میں تین سے چار مرتبہ نم اور صاف کرتے رہتے ہیں۔ (فرق صرف اتنا ہے کہ کار کے وائپرز دائیں بائیں حرکت کرتے ہیں جب کہ آنکھ کے پپوٹے اوپر سے نیچے کی طرف حرکت کرتے ہیں)۔ آنکھوں میں موجود یہ جراثیم کش رطوبت لائی سوزائم (Lysozime) کہلاتی ہے۔ اگر یہ رطوبت نہ ہو یا کم پیدا ہو تو آنکھیں خشک ہو جائیں، پپوٹے حرکت نہ کر سکیں اور انسان کی زندگی مشکلات سے دوچار ہو جائے۔ (اقتباس: جسم کے عجائبات)

اس کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل ابن عمرؓ کو دماغ، کھوپڑی، دل اور جگر کے مقام، بناوٹ اور ان اعضاء کی اہمیت کے بارے میں بتایا۔ لیکن ہم امام علیہ السلام کے کلام کے اس حصے کو تشریحات کے ساتھ آئندہ ابواب میں اس مقام پر پیش کریں گے جہاں امام علیہ السلام نے ان اعضاء کے بارے میں زیادہ تفصیل کے ساتھ گفتگو فرمائی ہے۔

فی الحال سلسلۂ کلام کے اس حصے کے اختتامی جملوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

ہڈیوں کا گودا

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"مفضل! اب ذرا غور کرو ہڈیوں میں موجود مغز کی طرف۔
دیکھو اس مغز (Bone Marrow) کو ہڈیوں کے اندر کیوں
محفوظ کیا گیا؟ مغز کو ہڈیوں میں اس لیے رکھا گیا کہ ہڈیاں اسے
شدید گرمی اور شدید سردی سے محفوظ رکھیں۔"

نوٹ: ہڈیاں معدنیات کا اسٹور

غذا کے ذریعے جو معدنیات جسم کے اندر آتی ہیں وہ ہڈیوں کے اندر ہی اسٹور ہوتی ہیں۔ کیلشیم، فاسفورس، معمولی مقدار میں فولاد، تانبا، کوبالٹ اور دوسرے معدنی اجزاء ہڈیوں ہی میں پائے جاتے ہیں۔ جسم کی روزانہ کی ضروریات کے مطابق معدنیات، جسم کے مختلف حصوں یا اعضاء کو ہڈیوں میں موجود معدنیات کے اسی اسٹور سے حاصل ہوتی ہیں۔

خون کے سرخ خلیے اور جسم کو بیماریوں سے بچانے والے سفید خلیے ہڈیوں کے گودے میں تیار ہوتے ہیں۔ جتنی دیر میں آپ پلک جھپکتے ہیں، اتنی دیر میں خون کے سرخ خلیے لاکھوں کی تعداد میں اپنی زندگی پوری کر کے مر جاتے ہیں لیکن اسی عرصے میں ہڈیوں کے گودے سے اتنے ہی نئے سرخ خلیے دورانِ خون میں شامل ہو چکے ہوتے ہیں۔

ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے والے مخصوص خلیے بھی ہڈیوں کے گودے میں تیار ہوتے ہیں اور ہڈی ٹوٹنے کی صورت میں دماغ کے حکم پر وہاں سے نکل کر دورانِ خون میں شامل ہو جاتے ہیں اور ٹوٹی ہوئی ہڈی کے مقام پر آ کر سیمنٹ کی طرح اس کے اردگرد چپکتے جاتے ہیں۔

جب ہڈی ہر طرف سے جڑ کر مضبوط ہو جاتی ہے تو ہڈیوں کے گودے سے دوسری طرح کے

خلیے دورانِ خون کے ذریعے ''حادثے کے مقام'' تک پہنچنے لگتے ہیں۔ یہ خلیے ہڈی کے اردگرد جمع ہونے والے اضافی ''سیمنٹ'' کو صاف کرنا شروع کردیتے ہیں۔

ان خلیوں کی یادداشت میں ہڈی کی اصل شکل محفوظ ہوتی ہے۔ یہ صرف ہڈی کے اردگرد موجود مصالحے کو کھاتے ہیں تاکہ ہڈی اصل شکل میں موجود رہے۔ اس کے بعد یہ خلیے ہڈیوں کے گودے میں واپس چلے جاتے ہیں۔ (حوالہ: جسم کے عجائبات)

ہڈیوں کے گودے کی اہمیت

ہڈیوں کا یہ گودا معلوم اور نامعلوم وجوہات کے سبب کبھی کبھی جسم کے دفاعی نظام کے سفید خلیے بنانا ''بھول'' جاتا ہے۔ جسم کے اردگرد موجود طرح طرح کی بیماریوں کے جراثیم جو ہر وقت جسم کے اندر داخل ہوتے رہتے ہیں جسم کا دفاعی نظام انہیں فنا کرتا رہتا ہے لیکن اگر ہڈیوں کا گودا دفاعی نظام میں کام آنے والے سفید خلیے بنانے میں ناکام ہو جائے تو ایک معمولی سی بیماری بھی انسان کے لیے جان لیوا ثابت ہوسکتی ہے۔ ایسے مریضوں کو چوبیس گھنٹے جراثیم سے پاک بند چیمبر میں زندگی گزارنا پڑتی ہے اور جراثیم سے پاک غذا اور پانی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اس بیماری کا علاج ہڈیوں کے گودے کی تبدیلی ہوتا ہے۔ ایسے مریض کو صحت یاب ہونے تک زندہ رہنے کے لیے روزانہ کم و بیش ایک ڈیڑھ لاکھ روپے کے اخراجات برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ ایسا مریض صحت یاب ہونے سے پہلے نہ کہیں آسکتا ہے، نہ جا سکتا ہے، نہ کسی سے ہاتھ ملا سکتا ہے، نہ عام غذا اور پانی استعمال کرسکتا ہے۔ (اقتباس: How Body Works)

یہ ہے ہڈیوں کے مغز، گودے یعنی (Bone Marrow) کی اہمیت جس کی طرف امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل ابن عمرؓ کو متوجہ فرمایا کہ اس مغز کو ہڈیوں میں اس لیے محفوظ رکھا گیا تاکہ یہ شدید گرمی میں پگھل نہ جائے اور شدید سردی میں جم نہ سکے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہڈیوں کا یہ گودا جم جائے یا پگھل جائے تو انسان کا جسم باقی تمام اعضاء کے صحیح سالم ہونے کے باوجود چند ہی دنوں میں زیرِ زمین منتقل ہوسکتا ہے۔

باب: 14

انسان کی دو اقسام، مرد اور عورت

مرد اور عورت کی تخلیق میں اللہ احسن الخالقین کے وجود کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں۔ اگر مادہ یا طبیعت (یعنی نیچر) نے انسانوں کو تخلیق کیا ہوتا تو کیا بے جان، بے شعور مادے میں یہ صلاحیت ہو سکتی تھی کہ وہ انسان کو دو مختلف اقسام یعنی مرد اور عورت کی شکل میں پیدا کرے اور ایک دوسرے کی ضروریات کے مطابق ان کے الگ الگ قسم کے اعضاء خاص مناسبتوں کے ساتھ بنائے اور ان دونوں اقسام کے انسانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے کشش پیدا ہو اور پھر اس سے مطلوبہ نتائج حاصل کیے جائیں۔

اس حوالے سے امام علیہ السلام نے مفضل بن عمرؓ سے فرمایا:

> "مفضل کیا تم نے کبھی غور کیا کہ انسان کی دو الگ الگ اقسام عورت اور مرد کی شکل میں کیوں پیدا کی گئیں۔ کس نے انہیں عورت اور مرد کی صورت پیدا کیا (تاکہ ان دو اقسام کے اختلاط سے نسل انسانی بڑھتی رہے۔ دنیا سے معدوم نہ ہونے پائے)۔
>
> انسانوں کو مرد و عورت کی شکل میں اسی ذات نے پیدا کیا جس نے انسانوں کو نسل بڑھانے والا بنایا۔ جس نے اس انسان کو امید والا پیدا کیا۔ (دنیا میں اگر صرف مرد ہی ہوتے یا صرف عورتیں ہی ہوتیں تو نسلِ انسانی کی افزائش کا کوئی ذریعہ نہ ہوتا)۔
>
> اسی طرح تم حیوانات پر غور کرو کہ ان میں صرف نر یا صرف

مادہ ہی کیوں پیدا نہیں ہوتی! مفضل دیکھو۔ حیوانات میں اگر صرف نر یا صرف مادہ پیدا ہوتے تو کیا ان کی نسل برقرار رہ سکتی تھی؟ اسی لیے ان کے بعض بچے نر پیدا ہوتے ہیں بعض مادہ''۔

الگ الگ طرح کے اعضاء

امام علیہ السلام نے فرمایا:

''مفضل اگر تم کسی دروازے کے دو کواڑوں یا پاٹوں میں سے کسی ایک کو الگ رکھا دیکھو جس میں کنڈی لگی ہوئی ہو تو کیا تمہارے ذہن میں یہ خیال نہیں آئے گا اگر دروازے کے ایک پٹ میں کنڈی موجود ہے تو یقیناً اس دروازے کا دوسرا حصہ بھی ہوگا جس میں اس کنڈی کو لگایا جاتا ہوگا تاکہ دروازہ اچھی طرح بند ہو سکے۔

تم دروازے کے اس ایک پٹ کو دیکھ کر سمجھ جاؤ گے کہ یہ دروازے کا ایک حصہ ہے۔ اسے دوسرے حصے سے جوڑا جائے گا تاکہ ان دونوں کے ملنے سے مطلوبہ فائدہ حاصل کیا جاسکے۔

اسی طرح تم نر حیوان کو دیکھو گے کہ وہ کسی جوڑے کا ایک فرد ہے۔ جوڑے کا دوسرا فرد اسی حیوان کی نسل کی مادہ ہے۔ جب یہ دونوں مل کر ایک خاص عمل سے گزرتے ہیں تو اس سے نئی نسل پیدا ہوتی ہے۔ بقائے نسل کا راز ایک ہی نسل کے دو ایک دوسرے سے کسی قدر مختلف حیوانوں کے تخلیق کے عمل سے

گزرنے میں پوشیدہ ہے۔''

(ذرا غور فرمائیں کہ دوسری صدی ہجری یا ساتویں صدی عیسوی میں اس طرح کے سوالات کیا کسی عام آدمی کے ذہن میں پیدا ہو سکتے تھے یا اس طرح کے سوالات اور ان کے جوابات کے بارے میں یونانی علماء کی تاریخ میں آپ نے کوئی ایسی چیز پڑھی ہے؟)

نوٹ: انسان کی دو اقسام

آپ نے کبھی غور کیا کہ بچہ پیدا ہوتا ہے تو کبھی وہ لڑکا کیوں ہوتا ہے اور کبھی لڑکی کیوں پیدا ہوتی ہے؟ لڑکا اور لڑکی کس طرح بنتے ہیں؟ دونوں کی الگ الگ شناخت، بناوٹ اور دونوں میں الگ الگ طرح کی خصوصیات کس طرح پیدا ہوتی ہیں؟

یہ سب، بڑے حیران کن مرحلے ہیں، اللہ تعالیٰ کی شان خلاقیت کے عظیم نمونے، عقل کو ششدر کر دینے والے شاہکار، اس کی انجینئرنگ کے بے مثال عجائبات، لیکن ہم چونکہ اس عمل کو اسی طرح دیکھتے آئے ہیں اس لیے ہمارے لیے یہ ایک عام سی بات ہے۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ اللہ کا یہ حیران کن معجزہ کس طرح رونما ہوتا ہے کہ دنیا میں آنے والے انسانوں میں سے کوئی مرد بن جاتا ہے اور کوئی عورت۔

ہم گزشتہ ابواب میں قارئین کو ڈی این اے کے بارے میں بتا چکے ہیں کہ انسان جسمانی طور پر جو کچھ بنتا ہے انھی ہدایات کے مطابق بنتا ہے جو اس کے ڈی این اے پر موجود ہوتی ہیں۔ ہر نیا انسان جو اس دنیا میں آتا ہے، ماں اور باپ کی طرف سے آنے والے 23+23 کروموسومز سے مل کر بننے والے ایک مخلوط خلیے کی صورت اپنی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ یہ خلیہ اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ اسے لائٹ مائکروسکوپ سے ہی کسی قدر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے تفصیلی معائنے کے لیے الیکٹران خردبین کی ضرورت پڑتی ہے جو کسی بھی چیز کی تصویر کو پچاس ہزار گنا یا اس سے بھی زیادہ بڑا کر کے دکھا سکتی ہے۔

عالمِ غیب میں جنس کا تعین

اس ننھے سے خلیے میں کُل 46 کروموسومز ہوتے ہیں جو ڈی این اے کے دھاگوں پر پائے جاتے ہیں۔ پھر اس خلیے میں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے (جس کی تفصیل بتانا اس وقت ممکن نہیں ہے) اور یہ سب کچھ ہماری حدِ بصارت سے بالاتر ہوتا ہے۔ گویا یہ سب کچھ ہمارے لیے ایک طرح کے ''غیب'' کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس غیب کے پردے میں وہ مخصوص ہدایات بھی ہوتی ہیں جو کسی انسان کی جنس کا تعین کرتی ہیں کہ اسے اس کارخانۂ قدرت میں کون سا کردار ادا کرنا ہے۔ اسے لڑکا بننا ہے یا لڑکی یعنی مرد یا عورت۔

اگر اسے مرد کا کردار ادا کرنا ہے تو اس کے لیے اسے اس کی ضرورت کے مطابق نادر و نایاب اعضاء دیے جاتے ہیں اور اگر اسے عورت کا کردار ادا کرنا ہے تو اسے ان خوبیوں سے نوازا جاتا ہے کہ یہ آنے والی نسلوں کو اپنے وجود میں جنم دے سکے اور اس دنیا میں نئی نسل کو قیام و طعام کی ابتدائی سہولتیں فراہم کر سکے۔

جنس کا تعین باپ کی طرف سے آنے والے مخصوص کروموزومز کے ذریعے ہوتا ہے۔ یہ افزائش نسل کی صلاحیت عطا کرنے والے کروموزومز ہیں۔ انہیں سیکس کروموسومز بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کروموزومز مرد اور عورت دونوں میں ہوتے ہیں اور دونوں کے کروموزومز کے ملنے سے ہی نئی زندگی کے وجود میں آنے کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔

لڑکا کیوں؟ یا لڑکی کیوں؟

خواتین کے جسم میں یہ کروموزومز 2 ہوتے ہیں اور دونوں ہی X کروموزومز کہلاتے ہیں۔ مَردوں کے جسم میں بھی اس طرح کے 2 کروموزومز پائے جاتے ہیں لیکن ان میں سے ایک X کروموزوم ہوتا ہے اور دوسرا Y کروموزوم کہلاتا ہے۔ افزائش نسل کے حیران کن نظام میں جب ماں اور باپ کے یہ کروموزومز ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو اگر باپ کا X کروموزوم ماں کے

کروموزوم سے مل گیا تو یہ اللہ کی ایک رحمت ہوتی ہے اور ان کے ملنے سے لڑکی پیدا ہوگی۔اس کے برعکس اگر باپ کا Y کروموزوم ماں کے X کروموزوم سے مل گیا تو یہ اللہ کی نعمت ہوگی اور ان کے ملنے سے لڑکا پیدا ہوگا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جنس کا تعین باپ کے کروموسوزوم سے ہوتا ہے۔لڑکی پیدا ہونے میں عورت کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔یہ معاملہ اللہ تعالیٰ نے مرد کے پاس رکھا ہے۔

X اور X کروموزوم کے ملنے سے لڑکی کیوں پیدا ہوتی ہے اور X اور Y کروموزومز کے ملنے سے لڑکا کیوں پیدا ہوتا ہے.....؟ دراصل ہوتا یہ ہے کہ حمل کے ابتدائی ہفتے میں X اور Y کے ملاپ سے تخلیق پانے والے ایمبرو (Embryo) میں اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی مصلحت و مشیت کے مطابق ایک خاص جین آن (On) ہو جاتی ہے۔اس جین (Gene) کو SRY جین کا نام دیا گیا ہے۔یہ جین Y کروموزوم پر پائی جاتی ہے۔

جین کے بارے میں آپ گزشتہ ابواب میں پڑھ چکے ہیں کہ جین دراصل ایک ہدایت ہوتی ہے۔DNA پر موجود ان جینز یا ہدایات کے مطابق ہی جسم انسانی کی تعمیر و تشکیل ہوتی رہتی ہے۔

بہر حال SRY نامی اس جین کے ذریعے DNA یہ ہدایت یا حکم جاری کرتا ہے کہ گوشت کے اس ننھے سے لوتھڑے کو لڑکا بنائے جانے کے عمل کا آغاز کر دیا جائے۔اس حکم کے ملتے ہی لڑکے کی تخلیق کے لیے رحم مادر میں عقل کو ششدر کر دینے والے معجزے رونما ہونے لگتے ہیں۔

مرد اور عورت دونوں ہی انسان ہیں لیکن اللہ تعالیٰ انہیں عام اعضاء مثلاً دل، جگر، پھیپھڑوں، ہاتھ، پیر، وغیرہ کے علاوہ ان کی ضروریات اور مطلوبہ خدمات کی انجام دہی کے لیے کچھ الگ الگ قسم کے اعضاء اور صلاحیتیں بھی عطا کرتا ہے، جن کی مدد سے نسلِ انسانی آگے بڑھتی ہے اور یہ کرۂ آبی زندگی سے معمور نظر آتا ہے۔

ضرورت کے مطابق اعضاء

اگر چند نادیدہ خلیوں کے اس مجموعے کو لڑکی بننا ہوتا ہے تو SRY نامی جین آن نہیں ہوتی۔

ایسی صورت میں DNA اس کے برعکس ہدایات جاری کرتا ہے اور خلیوں کے اس مجموعے میں قدرت کے وہ احکامات جاری ہوتے ہیں جن کے ذریعے گوشت کے اس ننھے سے ٹکڑے کے اندر ان اعضاء اور صلاحیتوں کی تشکیل و تعمیر ہونے لگتی ہے جو ایک عورت کے وجود کے لیے ناگزیر ہیں اور نو ماہ یا اس سے ذرا کم مدت میں ماں باپ کے گھر لڑکی پیدا ہوتی ہے اور سارے ماحول کو اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے معمور کر دیتی ہے۔

حیران کن بات یہ بھی ہے کہ لڑکی ہو یا لڑکا، جب یہ پیدا ہوتے ہیں تو اس وقت ان میں پچھلی نسل کی وہ تمام خصوصیات محفوظ ہوتی ہیں جنھیں ان کے ذریعے آئندہ نسلوں میں منتقل ہونا ہوتا ہے۔(اقتباس از: ڈی این اے۔جسم کی کتاب ہدایت)

امام علیہ السلام نے اپنی گفتگو میں مفضل ابن عمرؓ کو مرد اور عورت کے الگ الگ طرح کے اعضاء کی جانب بھی متوجہ فرمایا کہ ان دونوں کے اعضاء کس طرح ایک دوسرے کی مناسبتوں اور ضروریات کے مطابق کامل ترین شکل میں بنائے گئے۔ بتانے کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ تمام مخلوقات کا ایک ہی خالق ہے جس نے تخلیق انسانی میں ایک خاص منصوبے کے مطابق مناسب حال اعضاء تخلیق فرمائے (اس سلسلے میں اگر ہمارے قارئین تفصیلات جاننا چاہیں تو ہماری کتاب ''جسم کے عجائبات'' کا مطالعہ فرمائیں)

اللہ انھیں ہلاک کرے

امام علیہ السلام نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ ان جاہلوں کو ہلاک کرے جو فلسفی بننے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ان دل کے اندھوں کو انسان اور دوسرے ذی حیات کی عجیب و غریب خلقت اور ساخت میں خالق عالم کی نشانیاں نظر نہیں آتیں؟

ان کی ضد اور جہالت کا عالم یہ ہے کہ کہتے ہیں کہ خلقتِ
عالم میں کسی مدبر کی تدبیر (پلاننگ) نہیں، اس میں کسی ارادے
والے کا ارادہ اور منصوبہ بنانے والے کا کوئی منصوبہ ہی نہیں ہے"
(بلکہ یہ جہاں، یہ دنیا اور اس میں موجود مخلوقات خود بہ خود پیدا ہو گئی ہیں۔)

اگلے باب میں ہم آپ کو بتائیں گے کہ امام علیہ السلام نے افزائش نسل کے نظام کے بارے میں کیا حیران کن انکشافات فرمائے ہیں۔ وہ ایسے سائنسی انکشافات ہیں جن کے بارے میں نزولِ قرآن سے صدیوں پہلے اور صدیوں بعد بھی اس کرّہ ارض پر کسی انسان کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

باب : 15

افزائش نسل کے حیران کن طریقے

گزشتہ باب میں ہم نے امامؑ کے لیکچر کے اُس حصے کو نقل کیا تھا جس میں آپؑ نے انسان کی دو اقسام یعنی عورت اور مرد کی خلقت، ان کے الگ الگ اعضاء اور ان اعضاء کی ایک دوسرے سے ہم آہنگی اور مناسبتوں کے حوالے سے اپنے شاگرد مفضل ابن عمرؒ کو متوجہ فرمایا تھا۔ واضح رہے کہ اس حوالے سے امامؑ نے کئی اہم باتوں کی طرف بھی متوجہ فرمایا لیکن بعض اسباب کی بناء پر ہم نے وہ جملے اسی طرح نقل نہیں کیے۔ اس کے لیے اصل کتاب سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

حیران کن انکشافات

اس کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک عجب معجزانہ کلام ارشاد فرمایا۔ یہ ایک ایسا کلام اور ایک ایسا موضوع تھا کہ اس کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے پہلے قرآنِ مجید نے اپنی آیات میں انسانوں کو اس جانب اشارتاً متوجہ کیا تھا یا پھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اور امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے اپنے خطبات میں اس وقت کے لوگوں کے علم اور ذہنی سطح کے مطابق انھیں سرسری طور پر آگاہ کیا تھا۔ نزولِ قرآن سے صدیوں پہلے اور صدیوں بعد بھی کرۂ ارض پر موجود کسی تہذیب، ملک اور شہر میں کسی انسان کو اس موضوع کے بارے میں سرسری سا بھی علم نہیں تھا۔

یہی انکشافات آج ہمارا موضوع ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا موضوعِ گفتگو حیوانوں میں افزائش نسل ہے۔ اس حوالے سے گفتگو فرماتے ہوئے آپؑ نے مفضل ابن عمرؒ سے فرمایا:

"مفضل! یہ تو افزائش نسل کا ایک طریقہ ہے کہ (بچے ماں

باپ کے اختلاط سے پیدا ہوں) لیکن اب ذرا ان جانداروں پر بھی غور کرو جن کی نسل کی بقاء کے لیے ماں باپ دونوں کا ایک ساتھ ہونا ضروری نہیں ہے۔

ان جانداروں کی پیدائش خاص مادّوں کے جمع ہونے اور اس میں ایک خاص قوت کے پہنچ جانے کے عمل سے مکمل ہو جاتی ہے۔ ان جانداروں میں نر و مادہ کے درمیان تمیز نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً زنبور، انہیں دیکھو تو (ظاہراً) معلوم کرنا مشکل ہوگا کہ کون نر ہے اور کون مادہ''۔

نوٹ: مادّوں کے جمع ہونے سے پیدائش

امام علیہ السلام نے اس حوالے سے جو حیران کن انکشافات فرمائے ان سب کا احاطہ کرنا تو ہمارے لیے ممکن نہیں ہے لیکن اس کی دو مثالیں ایسی ہیں جن کے بارے میں آج سائنس پڑھنے والے بچے بھی جانتے ہیں اور وہ ہیں بیکٹیریا اور وائرس۔

1683 عیسوی تک ان کے بارے میں دنیا کا کوئی انسان کچھ نہیں جانتا تھا۔ بیکٹیریا کو سب سے پہلے ہالینڈ کے ایک بیدار مغز انسان ''انتھونی وون لیون'' نے اپنے محدب شیشے کی مدد سے دیکھا اور انیسویں صدی عیسوی میں جرمنی کے ماہر حیاتیات ''رابرٹ کاخ'' نے ثابت کیا کہ بعض بیکٹر یا بیماریاں پیدا کرتے ہیں۔

بیکٹیریا نامی مخلوق پر ایک نظر

بیکٹیریا یک خلوی یعنی ایک سیل Cell والی مخلوق ہے اور خود اپنے بل بوتے پر زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ دنیا میں کوئی جگہ، حتیٰ کہ دوسرے سیارے اور ستارے بھی بیکٹیریا سے خالی نہیں

ہیں۔ یہ ہر جگہ، ماحول، ہر درجۂ حرارت میں زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ برفانی علاقے اور آتش فشانی چٹانیں بھی ان سے خالی نہیں ہیں۔ سائنس دانوں کے مطابق بیکٹیریا زندگی کی ابتدائی شکل ہیں۔ (یہ بیکٹیریا کہاں سے آئے؟ اس کا جواب کسی سائنس دان کے پاس نہیں ہے)۔

ایک بیکٹیریا سے دوسرا بیکٹیریا پیدا ہوتا ہے

بیکٹیریا میں نر و مادہ نہیں ہوتے، یہ بس ایک مخلوق ہوتے ہیں اور ایک بیکٹیریا سے دوسرا بیکٹیریم پیدا ہوتا رہتا ہے۔ ان کا جسم موٹی سی جھلی سے ڈھکا ہوا ہوتا ہے۔ ان کے جسم میں نہ منہ ہوتا ہے، نہ کوئی سوراخ۔ اس کے باوجود یہ دنیا کی کم و بیش ہر چیز کو کھا پی کر چٹ کر جاتے ہیں۔ یہ چیزوں کو کھانے کے لیے یہ مختلف کیمیکلز اور انزائمز (خامروں) کا استعمال کرتے ہیں، جن کی وجہ سے گوشت، لکڑی، پھل، انسانوں اور جانوروں کے جسم، تیل، گوبر، ڈیزل، انسانی فضلہ، ہر چیز سیال مادے میں تبدیل ہو جاتی ہے اور یہ سیال مادہ بیکٹیریا کے جسم کی بیرونی جھلی کے اندر جذب ہو جاتا ہے۔

بیکٹیریا اپنی نسل میں انتہائی تیزی سے اضافہ کرتے ہیں۔ مثلاً ای کولائی (E.coli) نامی بیکٹیریا (یعنی بیکٹریم) بیس منٹ کے بعد ایک سے دو ہو جاتے ہیں اور اگلے بیس منٹ میں چار۔ ان کی افزائش نسل میں اگر اسی رفتار سے اضافہ ہوتا رہے تو اس حساب سے صرف 43 گھنٹوں میں ان کی تعداد اتنی ہو جائے گی کہ یہ سارے کرۂ ارض کو ڈھک دیں گے۔ یعنی یہ بیکٹیریا زمین کے 1,090,000,000,000,000,000,000, کیوبک میٹر کے علاقے پر پھیل جائیں گے اور اگر انہیں مزید دو گھنٹے اسی رفتار سے افزائش نسل کرنے کے مواقع فراہم رہیں تو ان کا وزن زمین کے مجموعی وزن یعنی 600,000,000,000,000,000,00 ٹن کے برابر ہو جائے گا۔ لیکن اللہ کا بنایا ہوا ایک نظام ان بیکٹیریاز کی تعداد کو کنٹرول میں رکھتا ہے۔

ایک اور مثال......وائرس

جہاں تک وائرس کا تعلق ہے تو اللہ کی یہ مخلوق بیکٹیریا سے بھی زیادہ حیران کن خصوصیات رکھتی ہے۔ وائرس کا پتا ہالینڈ ہی کے ایک ماہر نباتیات مارٹینس نے اٹھارویں صدی میں ایک تحقیق

کے دوران لگایا۔ وائرس بیکٹیریا کی طرح کی مخلوق نہیں ہے لیکن ان میں بھی افزائش نسل کے لیے نر و مادہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وائرس محض کچھ کیمیکلز کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ انہیں اپنی نسل کو بڑھانے کے لیے کسی ذی حیات کے جسم کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ذی حیات پیڑ، پودے، جانور، انسان حتیٰ کہ بیکٹیریا بھی ہو سکتے ہیں۔

وائرس کسی بھی ذی حیات کے جسم میں داخل ہو کر اس جسم کی حیاتیاتی مشینری کو کنٹرول کر لیتے ہیں اور اس کی مدد سے اپنی افزائش نسل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ وائرس کے اندر ایک DNA یا RNA ہوتا ہے۔ وہ اپنے DNA کو ذی حیات کے خلیے میں داخل کر کے اپنی کاپیاں بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ ماہرین کہتے ہیں کہ وائرس ایک خاص قسم کی جینز GENES کا مجموعہ ہیں جو زندہ خلیوں سے نکلی اور اس سے ایک الگ طرح کی مخلوق وجود میں آ گئی۔ ایسی مخلوق جو ذاتی حیثیت میں ''بے جان، بے روح'' کہی جا سکتی ہے لیکن یہ کسی ذی حیات کے جسم میں داخل ہو جائے تو بہت سی صورتوں میں اسے زندگی سے محروم کر دیتی ہے۔ ایڈز کا وائرس اس کی ایک مثال ہے۔

یہ دو مثالیں ہم نے امام جعفر صادق علیہ السلام کے ارشاد کے اس حصے کی وضاحت کے لیے پیش کیں جس میں آپ نے مادّوں کے جمع ہونے اور ان میں ایک خاص قوت کے پہنچ جانے سے افزائش نسل کا ذکر فرمایا تھا۔ اس میں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ اس طرح کے جانداروں میں نر و مادہ ہوتے ہی نہیں ہیں۔

نر حیوان کا ہونا ضروری نہیں

عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ کسی جانور کی افزائش نسل کے لیے ماں باپ دونوں کا ہونا ضروری ہے لیکن اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ایسی مخلوقات بھی پیدا کی ہیں جو افزائش نسل کے ان اصولوں سے بالاتر ہیں۔ ایسے ذی حیات کو پرتھینو جنیس (PARTHENO GENESIS) ذی حیات کہا جاتا ہے۔ پرتھینو جنیس، دراصل یونانی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے، کنواری یا باکرہ یا غیر شادی شدہ۔ اس طرح کے بہت سے ذی حیات اس کرۂ ارض پر موجود ہیں جن میں

افزائش نسل کے لیے باپ کی ضرورت نہیں ہوتی مثلاً:

۱۔**ٹرکی مرغی**: مرغے کے بغیر بار آور انڈے دیتی ہے۔ان انڈوں سے جو بچے نکلتے ہیں وہ ہو بہو اپنی ماں کی کاپی ہوتے ہیں۔

۲۔**ہیمر ہیڈ شارک اور ٹپ شارک**: یہ مچھلیاں بھی نر مچھلی کے بغیر بچے پیدا کرتی ہیں۔ان کے DNA ٹیسٹ سے معلوم ہوا کہ بچے کے اندر نر مچھلی کی جانب سے آنے والے کروموسوم موجود ہی نہیں تھے۔

۳۔**بڑی چھپکلیاں**: جنہیں ڈریگن کہا جاتا ہے،ان کی بعض اقسام میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

۴۔بچھو کی بعض اقسام میں بھی یہی خصوصیت پائی گئی ہے۔

افزائشِ نسل کے دوسرے حیران کن طریقے

۱۔ مچھلیوں کی کئی اقسام ایسی ہیں جو مادہ مچھلی پیدا ہوتی ہیں لیکن بڑے ہونے کے بعد یہ نر مچھلی میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔اسی طرح اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔مچھلیوں کی بعض اقسام افزائش نسل کے ایک موسم میں نر ہوتی ہیں اور اگلے موسم میں مادہ ہو جاتی ہیں۔

ان کے علاوہ سمندر میں ایسی مچھلیاں بھی پائی جاتی ہیں جو پندرہ بیس مادہ اور ایک نر کے گروپ میں رہتی ہیں۔نر مچھلی کا سائز بڑا ہوتا ہے اور اس کے رنگ بھی زیادہ ہوتے ہیں لیکن اگر نر مچھلی کسی سبب سے مر جائے تو اس صورت میں مادہ مچھلیوں میں سے کوئی ایک مچھلی نر مچھلی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔اس کے رنگ بھی بدل جاتے ہیں اور سائز بھی۔

۲۔ سب سے حیران کن معاملہ کیچوؤں کی بعض اقسام کا ہے۔ان کیچوؤں کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ہر کیچوے کے جسم میں نر کیچوے کے اعضاء بھی ہوتے ہیں اور مادہ کیچوے کے بھی۔ یعنی ایک ہی کیچوا نر بھی ہوتا ہے اور مادہ بھی۔

(اس حوالے سے تفصیلات جاننا چاہیں تو ہماری کتاب ’’DNA جسم کی کتاب ہدایت‘‘ کا مطالعہ فرمائیں)

باب: 16

انسان خود ایک زندہ معجزہ ہے

جسم انسانی اللہ تعالیٰ کا ایک زندہ معجزہ ہے۔ ایک ایسا معجزہ جو ہر شخص کے اپنے وجود کا حصہ ہے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ وہ کس طرح اس عمر تک پہنچا اور کس طرح زندہ ہے۔ اس نے کس طرح نشوونما پائی۔ اس کی جسمانی ضروریات کے مطابق غذا اسے کہاں سے، کس طرح حاصل ہوتی ہے۔ کس طرح اسے بھوک لگتی ہے۔ کس طرح غذا اس کی بھوک مٹاتی اور پانی اس کی پیاس بجھا کر اس کے جسم میں ہر لمحے کس قدر حیران کن کیمیائی معجزے رونما کرتا ہے، جانوروں کا گوشت، سبزیاں، پھل اور اناج کس طرح اس کے جسم کا حصہ بن جاتے ہیں؟ یہ باتیں سوچنے کا ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ ہم اللہ کے اس عظیم معجزے پر غور نہیں کرتے۔

بہر حال جسم انسانی اللہ تعالیٰ کے وجود کی عظیم نشانی ہے۔ اسی لیے امام جعفر صادق علیہ السلام نے جب اثباتِ وجودِ خدا کے دلائل مفضل ابن عمرؓ کے سامنے بیان فرمائے تو اس کے لیے سب سے پہلے جسمِ انسانی، اس کے اعضاء کی بناوٹ اور ان کی کارکردگی کو بیان کرنا شروع کیا۔ امام علیہ السلام نے اس وقت کے موجود علم اور اس دور کے انسان کی علمی سطح کے مطابق مختصراً لیکن انتہائی جامع معلومات فراہم کیں۔ یہ ایسی معلومات تھیں کہ اس دور سے صدیوں پہلے اور صدیوں بعد تک کسی فلسفی، سائنسدان یا کسی ماہرِ حیاتیات نے انہیں اس طرح نہ سمجھا تھا اور نہ بیان کیا تھا۔

اس باب میں ہم امام جعفر صادق علیہ السلام کے ان ارشادات کو رقم کر رہے ہیں جن میں امام علیہ السلام نے ناخنوں، جلد کی مختلف اقسام اور بالوں کے بارے میں مفضل ابن عمرؓ کو بتایا کہ ان کا ہونا کیوں ضروری تھا اور ان کے پیدا کرنے میں اللہ احسن الخالقین کی کس قدر عظیم حکمتیں اور مصلحتیں موجود ہیں۔

ناخن کیوں پیدا کیے گئے؟

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"مفضل! کیا کبھی تم نے اس بات پر غور کیا کہ انگلیوں پر ناخن کیوں پیدا کیے گئے؟ یہ ناخن اللہ تعالیٰ نے انگلیوں پر اس لیے پیدا کیے کہ انگلیوں کو چوٹ لگنے سے محفوظ رکھیں اور کام کرنے میں مدد فراہم کریں۔"

نوٹ: ناخن کیا ہیں؟

ناخن دراصل ہمارے جسم کی جلد ہی میں سے آگے بڑھتے ہیں اور ایک خاص سائز اختیار کرنے کے بعد یہ مردہ ہو جاتے ہیں۔ ہمارا سارا جسم پروٹین (گوشت) سے بنا ہے۔ ناخن میں جو پروٹین (گوشت کی قسم) استعمال ہوتی ہے اسے سائنسی زبان میں کریٹین (KERATIN) کہا جاتا ہے۔ ہمارے بال بھی پروٹین کی اسی قسم سے پیدا ہوتے ہیں۔ بکری کے کھر، بطخ کے پر، چوپایوں کے سینگ بھی اسی پروٹین سے بنتے ہیں۔ (بالوں کے بارے میں ہم سائنسی معلومات گزشتہ کسی باب میں بیان کر چکے ہیں)

ناخنوں کے بڑھنے کی رفتار ہر شخص میں الگ ہوتی ہے۔ اسی طرح دائیں اور بائیں ہاتھ کے ناخن بھی یکساں رفتار سے نہیں بڑھتے۔ جس ہاتھ سے آپ زیادہ کام کرتے ہیں، اس ہاتھ کے ناخن زیادہ تیزی سے بڑھتے ہیں۔

اگر ناخن انگلیوں پر نہ ہوں تو انگلیوں کے زخمی ہونے کے امکانات بڑھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ناخن انگلیوں کے سروں کو خاص طرح کی سختی فراہم کرتے ہیں جس کی عدم موجودگی میں قلم پکڑنا، گاڑی کا اسٹیئرنگ سنبھالنا، کوئی باریک چیز زمین سے اٹھانا ممکن نہ ہوتا۔ مثلاً سوئی اٹھانا، سوئی میں دھاگا ڈالنا اور ہزاروں دوسرے کام۔

ناخن اور بال کاٹے کیوں جاتے ہیں؟

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"مفضل! اس بات پر غور کرو اور اسے سمجھو کہ بالوں اور ناخنوں کا منڈنا اور کٹنا کیوں ضروری ہے؟ اور اس میں انسان کے لیے کیا بہتری ہے؟

دیکھو! یہ دونوں بڑھتے اور زیادہ ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان کے اوپری حصے میں کمی کی جائے۔ تم دیکھو! بال (جلد سے نکلتے ہی) اور ناخن ایک خاص حد تک بڑھنے کے بعد مردہ ہو جاتے ہیں تا کہ آدمی کو انہیں کاٹنے میں تکلیف نہ ہو۔

اگر بالوں اور ناخنوں کے کٹنے میں (ذرا سی بھی) تکلیف ہوا کرتی تو انسان دو طرح کی زحمتوں کے درمیان پھنس جاتا۔ یا تو وہ انہیں بڑھنے دیتا (اور انسان سے زیادہ جانور معلوم ہونے لگتا) اور جب یہ زیادہ بڑھ جایا کرتے تو بڑی زحمتوں میں مبتلا ہو جاتا یا اگر وہ انہیں کٹوانے کا فیصلہ کر لیتا تو اسے کٹوانے کی تکلیف برداشت کرنا پڑتی۔"

مفضل ابن عمرؓ نے عرض کی۔ "آقا! یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں ایسا بناتا کہ یہ بڑھا ہی نہ کرتے کہ انسانوں کو انہیں

کٹوانے کی ضرورت پیش آئے؟"

کئی امراض بالوں اور ناخنوں کے ذریعے دور ہوتے ہیں

امام علیہ السلام نے جواب دیا۔

"اللہ تعالیٰ یقیناً ایسا کرنے پر قادر ہے لیکن ہر کام میں اس کی کچھ مصلحتیں ہیں (اور یہ بندوں ہی کے فائدے کے لیے ہیں) بندے ان مصلحتوں اور نعمتوں کو نہیں جانتے۔ اگر جانتے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کرتے۔

مفضل! بات دراصل یہ ہے کہ جسم انسانی کے بہت سے امراض اور تکالیف بالوں کے ذریعے دور ہوتے ہیں جو (جلد کے) مسامات سے باہر نکلتے ہیں اور انگلیوں کے امراض ان ناخنوں کے بڑھنے کی وجہ سے دور ہوتے ہیں۔ ہفتے میں ایک مرتبہ بال کٹوانے، نورہ لگانے اور ناخن ترشوانے کا حکم اسی لیے دیا گیا ہے تاکہ بال اور ناخن جلدی جلدی نکلیں اور جسم کے اندر موجود بیماریاں (فاسد زہریلے مادے) ان کے ذریعے جسم سے خارج ہوتے رہیں۔

بال اور ناخن جب ضرورت سے زیادہ بڑھ جائیں تو ایسی صورت میں بھی انسان کو بیماریوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اگر ان کے بڑھنے کی رفتار معمول سے کم ہو جائے تو ایسی

صورت میں بھی طرح طرح کے درد اور امراض پیدا ہو سکتے ہیں۔"

بال جسم پر ہر جگہ ایک سے نہیں ہیں

"اس بات پر بھی غور کرو مفضل! کہ جسم پر موجود بال بھی سب جگہ یکساں نہیں ہیں۔ بعض مقامات کو بالوں سے مبرا قرار دیا گیا ہے اور اس میں اللہ کی بڑی نعمتیں اور انسان کے لیے بڑے فوائد ہیں۔

مثلاً دیکھو! یہ بال اگر آنکھوں کے اندر بھی نکلا کرتے تو کیا انسان اندھا نہ ہو جاتا۔ جس طرح کے بال داڑھی یا سر پر اُگتے ہیں اسی طرح کے بال اگر منہ میں بھی نکلتے تو کھانے پینے کی لذت ہی ختم ہو جاتی۔ نہ غذا کا ذائقہ پتا چلتا، نہ لقمہ حلق تک پہنچتا، نہ پانی کا گھونٹ آسانی سے منہ میں جاتا۔"

ہاتھوں کی جلد اور بال

"تم اپنے ہاتھوں کو دیکھو۔ ہاتھوں کے اوپر (کسی اور طرح کی جلد ہے جس پر) بال موجود ہیں۔ ہتھیلیوں کی طرف سے ہاتھوں کو دیکھو تو یہاں (اور طرح کی جلد ہے) یہاں بال یا روئیں کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ اگر ہتھیلیوں پر بھی بال ہوتے تو انسان کی قوتِ لامسہ متاثر نہ ہوتی۔ انسان ہاتھوں ہی کے ذریعے کسی شئے کی نرمی، سختی (درجۂ حرارت) وغیرہ کو محسوس کرتے ہیں۔ اگر یہاں بال ہوتے تو انسان کسی شئے کو چھو کر اس کے بارے میں کس

طرح معلوم کر سکتے تھے؟"

بعض مقامات بالوں سے خالی ہیں

"اسی طرح کئی اور مقامات ہیں جہاں بال ہوتے تو انسان بہت سی لذتوں اور راحتوں سے محروم ہو جاتا اور اپنے مقاصد حیات میں سے بعض کو حاصل کرنے میں ناکام رہتا۔" (مفہوم)

تو مفضل دیکھو! کیا بے شعور مادے اور علم، عقل، ارادے اور قدرت سے محروم طبیعت (نیچر) ان تمام مصلحتوں کی (پیشگی) منصوبہ بندی کر سکتی تھی، ان حکمتوں اور ضرورتوں کو سمجھ سکتی تھی کہ انسان کو کب کہاں کس چیز کی ضرورت پڑے گی۔ اس طرح کے حکیمانہ کاموں کو کیا کوئی عقل رکھنے والا شخص مادّے یا طبیعت کی طرف منسوب کر سکتا ہے؟

دوسرے ذی حیات میں بھی ایسا ہی ہے

مفضل! یہ جو میں نے بالوں کے مقامات کے حوالے سے تمہیں بتایا تو یہ صرف انسانوں ہی سے مخصوص نہیں ہے۔ چوپایوں، درندوں اور پرندوں میں بھی تم ایسا ہی پاؤ گے کہ اگر چہ ان کے جسم بالوں یا پروں سے ڈھکے ہوتے ہیں لیکن وہ مقامات جہاں بالوں کا ہونا انہیں ان کی غرضِ خلقت میں سے ایک بے حد اہم غرض و غایت سے روکتا، وہاں بال پیدا نہیں کئے

گئے۔ انسانوں یا دوسرے ذی حیات میں اپنی نسلوں کو آگے بڑھانا، ان کی غرضِ خلقت میں سے ایک انتہائی اہم غرض، ایک انتہائی ضروری مقصد ہے۔"

بدن سے متعلق مشقت

"اور مفضل! تم نے کہا تھا کہ اگر بال اور ناخن نہ بڑھا کرتے اور نہ کٹوانا پڑتے تو کیا تھا؟ تو اس میں ایک حکمت و مصلحت یہ بھی ہے کہ جہاں آدمی کو اپنے بدن سے متعلق کچھ مشقت اٹھانا پڑتی ہے، ان مشقتوں میں سے ایک یہ بھی قرار دی گئی ہے۔ اس لیے کہ جتنی دیر وہ اپنے بدن کی صفائی اور بالوں کے دور کرنے میں مصروف رہے گا، اتنی دیر اپنے حرص و ظلم، غرور و تکبر اور ظلم سے بچا رہے گا۔"

نوٹ: بال جسم کے بیرونی حصوں پر ہوتے ہیں

بال ہمارے سارے جسم پر پائے جاتے ہیں لیکن سر، داڑھی اور چند دوسرے مقامات کے علاوہ یہ بال سارے جسم پر باریک روئیں کی شکل میں ہوتے ہیں اور جلد کے ہم رنگ ہوتے ہیں۔ خواتین کے یہاں یہ رواں جلد کے ہم رنگ، بہت باریک اور نادیدہ ہوتا ہے۔ (بعض افراد میں اس کے برعکس بھی ہوتا ہے) انسانی جسم پر ان بالوں کی تعداد تیس لاکھ سے زیادہ ہوتی ہے۔ ہر بال کے گرد بہت چھوٹے پٹھے ہوتے ہیں۔ جو ان بالوں کی حرکات کو کنٹرول کرتے ہیں۔
مرد اور عورت دونوں ہی انسان ہیں لیکن مردوں کے داڑھی نکلتی ہے اور خواتین کے چہرے پر داڑھی کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا۔ تو سوال یہ ہے کہ مرد و عورت میں یہ الگ الگ طرح کے

انتظامات کس طرح ممکن ہوئے؟ کیا ایک بے شعور مادّے میں یہ صلاحیت ہو سکتی ہے کہ وہ مرد و عورت کے پیدا ہونے سے پہلے ان کی ضروریات کو جانتا ہو اور پھر اسی کے مطابق مَردوں میں الگ طرح کے بال پیدا کرنے کے انتظامات کرے اور خواتین میں دوسری طرح کے بال پیدا کرنے کا اہتمام کرے؟ پھر یہ مادّہ جو خود ابھی وجود ہی میں نہیں آیا تھا، اس کے لیے یہ حیران کن انتظامات کرنا تو کجا، اس میں زمین پر گھاس کا تنکا اُگانے کی بھی صلاحیت ہو سکتی ہے؟

یہ سب احمقانہ باتیں ہیں۔ آج سائنس ان سب احمقانہ خیالات کے خلاف ہر روز نت نئے دلائل پیش کر رہی ہے۔ اِثباتِ وجودِ خدا کے ایسے ثبوت پیش کرنا اور کسی کو سمجھانا شاید گزشتہ ادوار میں اتنا آسان نہیں تھا۔

باب: 17

دل کو سینے میں کیوں رکھا گیا؟

امام علیہ السلام نے فرمایا:

''کیا تم نے غور کیا کہ دل کو سینے میں کیوں رکھا گیا اور کس نے اسے وہ چادر اُڑھائی جسے تم جھلّی کہتے ہو اور کس نے اس کی حفاظت کے لیے اسے ایسی جگہ رکھا جو پسلیوں کی ہڈیوں کے حفاظتی حصار میں ہے۔ کس نے گوشت اور پٹھوں کے ذریعے اس کی حفاظت کی جو اس کے اوپر ہیں تا کہ اس تک کوئی ایسی چیز نہ پہنچے جو اس میں خراش ڈال دے۔''

نوٹ: دل اور میڈیکل سائنس

دل ہمارے سینے کی مضبوط ہڈیوں اور پسلیوں کے درمیان ہوا کے ذخیروں یعنی پھیپھڑوں کے درمیان مخصوص قسم کی جھلی کی پٹیوں کی مدد سے لٹکا ہوا ہے۔ اس کے عقب میں ریڑھ کی ہڈی ہے اور اس کے قریب ہی ہمارا جگر موجود ہے۔

دل کا سائز تقریباً ہر انسان کی مٹھی کے برابر ہوتا ہے۔ اس کے اندر چار چیمبرز ہوتے ہیں اور یہ کسی پمپنگ مشین کی طرح چوبیس گھنٹے خون کو جسم کے اندر پمپ کرتا رہتا ہے۔

دل کے نصف بالائی حصے میں جسم کا استعمال شدہ گندہ خون آ کر جمع ہوتا ہے اور اسی سمت کے دوسرے چیمبر میں چلا جاتا ہے۔ دل کا یہ چیمبر اس گندے خون کو فوراً ہی قریب موجود پھیپھڑوں کی طرف روانہ کر دیتا ہے۔ پھیپھڑے اس خون کے اندر موجود زہریلے مادّے، کاربن ڈائی آکسائیڈ کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اور سانس نکالنے کے دوران یہ زہریلی گیس

پھیپھڑوں سے خارج ہو جاتی ہے اور اسی دوران تازہ آکسیجن خون کے سرخ خلیوں میں بھر جاتی ہے۔ پھر یہ خون دل کے نچلے بائیں چیمبر میں آتا ہے۔ اس چیمبر کا نچلا حصہ اس خون کو دوبارہ جسم کی جانب پمپ کر دیتا ہے۔

بہ ظاہر یہ ایک سادہ سا عمل ہے لیکن ہماری زندگی کے لیے دل یہ خدمت ایک منٹ میں اوسطاً 72 مرتبہ، ایک گھنٹے میں 4320 مرتبہ اور ایک دن میں 103680 مرتبہ سرانجام دیتا ہے۔ ایک لاکھ تین ہزار چھ سو اسی کے اس عدد کو اگر آپ اپنی زندگی کے آج تک کے دن کے عدد سے ضرب دیں تو حاصلِ ضرب حیران کن ہی نہیں ناقابلِ شمار بھی ہوگا اور آپ خود کو اللہ کے احسانات کا شمار کرنے میں بالکل بے بس اور مجبور محسوس کریں گے۔ لیکن اگر آپ نے اپنی بے بسی کو محسوس کر لیا تو شاید یہی احساس شکرِ نعمت بن جائے۔

آپ یہ سن کر بھی حیران ہوں گے کہ اگر اس وقت آپ کی عمر 45 سال کے قریب ہے تو آپ کا دل اب تک آپ کے جسم میں کم و بیش تین لاکھ ٹن خون پمپ کر چکا ہے۔

یوں تو جسم کا سارا خون ہی دل میں سے گزرتا ہے اور سارے جسم کو غذائی اجزاء فراہم کرتا ہے لیکن خود دل کو بھی غذا درکار ہوتی ہے اور یہ غذا دو شریانوں (Arteries) کے ذریعے دل کو فراہم ہوتی ہے۔ یہ شریانیں کورونری آرٹیریز (Coronary Arteries) کہلاتی ہیں اور دیوار پر چپک کر چڑھنے والی بیل کی شاخوں کی طرح دل کے دائیں اور بائیں سمت چپکی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان دو شریانوں سے مزید چھوٹی شریانیں منسلک ہوتی ہیں اور پورے دل کے اوپر پھیلی ہوتی ہیں انہی کے ذریعے دل کو غذا کی فراہمی کی جاتی ہے۔

دل سے خون اسی وقت جسم کی طرف روانہ ہوتا ہے جب دل کے گرد موجود پٹھے اسے دباتے ہیں۔ دل سکڑتا ہے تو خون اس سے نکل کر جسم کی طرف سفر کرنا شروع کر دیتا ہے اور جسم کے ایک ایک حصے، عضو اور ایک ایک خلیے کو اس کی مطلوبہ خوراک پہنچانا شروع کر دیتا ہے۔

(حوالہ: جسم کے عجائبات)

آواز کا سوراخ

امام علیہ السلام نے مفضل سے فرمایا:

"اور مفضل دیکھو کہ آواز کے سوراخ پر کس نے ایک ڈھکنا ڈھانکا جو غذا یا پانی کو پھیپھڑوں تک پہنچنے سے روکتا ہے۔ اگر غذا یا پانی پھیپھڑوں میں چلا جائے تو انسان کی موت واقع ہو سکتی ہے۔"

نوٹ: حلق کا نظام

امامؑ کے اس حیران کن انکشاف کی تشریح ہم گزشتہ صفحات پر بیان کر چکے ہیں لیکن یہاں مختصراً آپ کو بتا دیں کہ ہمارے حلق کے اندر پائپ نما دو نالیاں ایک دوسرے کے قریب موجود ہیں۔ ایسوفیگس (Esophagus) نامی نالی کے ذریعے غذا اور پانی ہمارے معدے میں جاتا ہے۔ سانس کی نالی کو ٹریکیا (Trachea) کہا جاتا ہے۔ جب آپ کوئی چیز نگلتے ہیں، مثلاً غذا کا نوالہ، پانی کا گھونٹ یا لعابِ دہن تو آپ کے گردن کے درمیان ایک ہڈی ابھرتی نظر آتی ہے۔ جب یہ ہڈی اوپر اٹھے تو اس کا مطلب ہے کہ ایک مخصوص ڈھکن نے سانس کی نالی کو ڈھک دیا ہے تا کہ غذا یا پانی سانس کی نالی میں نہ چلا جائے۔ اس ڈھکن کو سائنسی زبان میں اپی گلوٹس (Epiglottis) کہا جاتا ہے۔ امامؑ نے سانس کی نالی کو ڈھکنے والے اسی عضو کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

اگر پھیپھڑے کام کرنا بند کر دیں

اس کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"مفضل! ذرا دیکھو تو کہ یہ کس نے پھیپھڑوں کو دل کا پنکھا بنایا کہ یہ تھکتا ہی نہیں اور نہ کبھی اپنے کام سے رکتا ہے۔ اگر پھیپھڑے ذرا دیر کو بھی کام کرنا بند کر دیں تو انسان کی موت واقع ہو جائے۔"

نوٹ: دل اور پھیپھڑوں کا رشتہ

اوپر کی سطور میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ دل گندے خون کو پھیپھڑوں میں پمپ کرتا ہے۔ پھیپھڑوں کے اندر ایک پیچیدہ نظام موجود ہے۔ آیئے ایک سرسری سی نظر اس نظام پر ڈالتے ہیں تاکہ ہم امام علیہ السلام کے اس مختصر کلام کی عظمت کو کسی قدر سمجھ سکیں!

آپ کے سینے کے اندر تین سیکشن یا کمپارٹمنٹ ہیں۔ یہ تینوں حصے ایک دوسرے کے قریب لیکن الگ الگ اور سیل بند ہیں۔ ان میں سے دو خانوں میں ہمارے پھیپھڑے کام کرتے ہیں اور درمیانی خانے یا کمپارٹمنٹ میں ہمارا دل خدمات سرانجام دیتا ہے۔

آپ کے سانس لینے کی نالی جس کا سائز چار انچ ہے نیچے جا کر دو شاخوں میں بٹ جاتی ہے۔ ان شاخوں کو برانکیل ٹیوبس (Bronichial Tubes) کہا جاتا ہے اور یہ دونوں شاخیں دائیں اور بائیں پھیپھڑے میں داخل ہو جاتی ہیں۔ پھیپھڑے کے اندر آنے کے بعد یہ دونوں شاخیں بے شمار چھوٹی شاخوں میں تقسیم ہوتی چلی جاتی ہیں اور آخری مرحلے میں یہ ہماری حد بصارت سے بالاتر ہو جاتی ہیں۔

خون کے سرخ خلیوں سے کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس کو نکال کر ان میں تازہ آکسیجن بھرنے کا کام اسی مرحلے میں سرانجام پاتا ہے۔

حدِ بصارت سے بالاتر یہ نالیاں جن کی چوڑائی ایک انچ کے سوویں حصے کے برابر ہوتی ہے، پھیپھڑوں میں موجود ہوا کی تھیلیوں پر چپکی ہوئی ہوتی ہیں۔ ہوا کی ان تھیلیوں کی شکل انگور جیسی ہوتی ہے اور یہ صرف خردبین ہی سے نظر آ سکتی ہیں۔ ہوا کی ان تھیلیوں کو ایل ویولائی (Alveoli) کہا جاتا ہے۔

دل سے آنے والا گندا خون جب یہاں سے گزرتا ہے تو خون کے سرخ خلیوں کو ان باریک ترین نالیوں سے گزرنے کے لیے کیو (Que) بنانا پڑتا ہے۔ یعنی خون کے خلیے ان نالیوں میں سے لائن بنا کر ایک ایک کر کے گزرتے ہیں۔ اس مرحلے پر سرخ خلیوں میں موجود کاربن ڈائی

آکسائیڈ (زہریلی گیس) خون کی باریک ترین نالیوں کے نچلے حصے میں جذب ہو جاتی ہے اور ہوا کی تھیلیوں (Alveolies) کے اندر موجود تازہ آکسیجن خلیوں کے اوپری حصے میں جذب ہوتی جاتی ہے۔ تازہ آکسیجن کے بھرتے ہی خون کے یہ سرخ خلیے واپس دل کی طرف آتے ہیں جہاں سے اس تازہ زندگی بخش خون کو دوسری ضروریات زندگی کے ساتھ دوبارہ جسم کی طرف روانہ کر دیا جاتا ہے۔

شاید یہی سبب ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے پھیپھڑوں کو دل کا پنکھا کہا ہے اور یہ بھی فرمایا کہ یہ کبھی تھکتا نہیں۔ اس کا مطلب بھی واضح ہے کہ پھیپھڑے انسان کے پیدا ہونے کے پہلے لمحے سے اپنا کام کرنا شروع کرتے ہیں اور آخری سانس تک اس کے لیے بلا تعطل، بلا معاوضہ یہ خدمات سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ (حوالہ: جسم کے عجائبات)

سوراخ اور ڈوریاں

امام علیہ السلام نے مفضل ابن عمرؒ سے فرمایا:

> ''تم نے کبھی غور کیا کہ یہ کس نے پیشاب اور فضلے کو جسم سے خارج کرنے والے سوراخوں میں ایسی ڈوریاں لگائیں جو ان دونوں کو روکے اور سمیٹے رکھتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ گندے مادے بہتے ہی رہا کرتے اور انسان کی زندگی انتہائی تلخ اور ناگوار ہو جاتی۔''

نوٹ: نکاسی کا نظام

امام علیہ السلام نے جسم سے فاضل اور گندے مادوں کے خارج ہونے کے جس نظام کی طرف اشارہ فرمایا اور جن ''ڈوریوں'' کا ذکر کیا وہ حیران کن باتیں ہیں۔ امام علیہ السلام کے دور

سے صدیوں پہلے اور صدیوں بعد تک کسی کو بھی حتمی طور پر یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ نظام کس طرح کام کرتا ہے۔ یہ قیمتی معلومات ماہرینِ حیاتیات کو 19 ویں صدی عیسوی میں معلوم ہونا شروع ہوئیں۔آیئے اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے اس نظام کو فزیالوجی کی مدد سے کسی قدر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہم جب کوئی غذا استعمال کرتے ہیں تو وہ معدے میں جا کر قابلِ ہضم بنتی ہے اور پیسٹ کی سی شکل اختیار کر لیتی ہے۔معدہ اس پیسٹ کو چھوٹی آنت کی طرف روانہ کرتا ہے اس وقت یہ تیزابی ماڈوں سے بھری ہوتی ہے۔اسی لیے چھوٹی آنت ایک رطوبت پیدا کرنے لگتی ہے۔ یہ رطوبت پلک جھپکنے کی سی مدت میں آپ کے لبلبے (Pancreas) تک پہنچتی ہے۔اس کے ردعمل میں لبلبہ ایک نمکین رطوبت پیدا کرنے لگتا ہے اور یہ نمکین رطوبت چھوٹی آنت میں آکر گرنے لگتی ہے اور تیزابی اثرات کو بے اثر کر دیتی ہے۔

اسی دوران صفرا (Bile) جگر سے تیار ہو کر یہاں آتا ہے اور چکنائی یا چربی کے بڑے ذرّات کو چھوٹے ذرّات میں تبدیل کر دیتا ہے۔

چھوٹی آنت کے بعد آنت کے دوسرے حصے ہیں اور ہر حصہ غذا پر اپنا اپنا کام کرتا ہے۔ بڑی آنت اس گاڑھے سیال سے تمام پانی نکال کر اسے دورانِ خون میں واپس کر دیتی ہے۔اسی دوران غذا میں موجود تمام غذائی اجزا بھی دورانِ خون میں شامل ہو جاتے ہیں۔

فاضل ماڈے، آنتوں میں موجود بیکٹیریا اور غذا کے ناقابلِ ہضم اجزاء پر مشتمل ہوتے ہیں وہ نسبتاً سخت حالت میں بڑی آنت کے آخری حصے ریکٹم سے ذرا پہلے ایک مقام پر اسٹور ہو جاتے ہیں اور وقتِ مقررہ پر انسان کی خواہش اور ارادے کے مطابق جسم سے باہر نکل جاتے ہیں۔

اگر انسان پیٹ کی کسی بیماری میں مبتلا ہو تو فاضل ماڈوں کے اسٹور کرنے اور مناسب وقت پر انھیں خارج کرنے کی یہ سہولت عارضی طور پر معطل ہو جاتی ہے۔اس پر انسان کا کنٹرول نہیں رہتا۔

اس کے علاوہ جسم سے خارج ہونے والے زہریلے یا فاسد ماڈوں میں مقدار کے لحاظ سے

سب سے زیادہ اور سب سے زہریلا مادّہ پیشاب کی صورت میں جسم سے خارج ہوتا ہے۔

عام طور پر لوگ سوچتے ہیں کہ ہم جو پانی پیتے ہیں وہ پیشاب بن کر جسم سے نکل جاتا ہے۔ لیکن بات اتنی سادہ نہیں ہے۔ اس پانی کو جسم کا ایک ایک خلیہ استعمال کرتا ہے جس کے سبب یہ پانی زہریلا ہو جاتا ہے اور یہ زہریلے مادّے ایک انتہائی پیچیدہ نظام سے گزر کے جسم سے خارج ہو جاتے ہیں۔

ہمارے جسم میں ہر وقت تقریباً ساڑھے چار لیٹر خون موجود رہتا ہے اور مسلسل سفر میں رہتا ہے۔ ہمارے گردے اس خون کو بار بار صاف کرتے رہتے ہیں۔ یہ خون چوبیس گھنٹوں میں 48 مرتبہ ہمارے گردوں میں صفائی کے لیے آتا ہے۔ ہر مرتبہ اس کے اندر زندگی کے لیے ضروری اجزاء کے ساتھ ساتھ بے شمار زہریلے مادّے بھی موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً ضرورت سے زیادہ نمک اور پوٹیشیم جو غذا کے ذریعے جسم میں آتے ہیں۔

اگر فاسد مادّے جسم سے خارج نہ ہوں

اضافی نمک جسم سے خارج نہ ہو تو پیٹ اور پاؤں پھولنے لگیں گے اور دل پر بوجھ بڑھ جائے گا۔ پوٹیشیم کی مقدار جسم میں کم ہو تو پٹھے کمزور پڑ جائیں گے اور سانس لینا مشکل ہو جائے گا۔ اس کی مقدار ضرورت سے زیادہ ہو جائے تو دل کی دھڑکنیں بے قابو ہو جائیں گی۔

ہمارے گردے ان دونوں کی مقدار پر نظر رکھتے ہیں اور اضافی نمک یا پوٹیشیم کو دورانِ خون سے نکال کر اسے ہمارے مثانے کی طرف روانہ کرتے رہتے ہیں۔

جسم کا سب سے زیادہ اور مہلک فضلہ یوریا (Urea) ہوتا ہے۔ یہ زہریلا مادہ پروٹین یعنی گوشت کے ہضم ہونے کے دوران پیدا ہوتا ہے۔ جسم میں اس کی کمی جگر میں کسی خرابی کی نشاندہی کرتی ہے اور اس کی زیادتی ایک انتہائی خطرناک بیماری "یوری مک پوائزننگ" کا سبب بن جاتی ہے۔ اس سے مریض گہری غنودگی میں جا سکتا ہے۔ جب گردے اسے نکالنے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو یہ فاسد مادہ پسینے کے مسامات سے نکلنے لگتا ہے۔

اسی لیے ہمارے گردے ہر وقت ان سارے مادّوں پر نظر رکھتے ہیں اور اضافی مادّوں کو تھوڑا تھوڑا کر کے دو ٹیوبس (Ureters) کے ذریعے اپنے نیچے موجود مثانے میں گراتے رہتے ہیں۔ یہ پیشاب مثانے میں اسٹور ہوتا رہتا ہے۔

مثانے کے اندر اللہ نے دو والو بنائے ہیں۔ ان دونوں والوز کو اسفنکٹرز (Sphincters) کہا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک مثانے کے اوپر والے حصے میں ہوتا ہے۔ جب مثانہ پیشاب سے بھر جاتا ہے تو یہ والو کھل جاتا ہے۔

دوسرا والو اس کے نیچے ہوتا ہے اور اسے کھولنا آپ کے اختیار میں ہوتا ہے۔ جب پہلا والو کھلتا ہے تو آپ کو پیشاب کی حاجت محسوس ہوتی ہے لیکن آپ چاہیں تو پیشاب کچھ دیر کے لیے روک سکتے ہیں کیوں کہ مثانے کا دوسرا والو کھولنا آپ کے اختیار میں ہوتا ہے۔ آپ مناسب جگہ مقام و موقع دیکھ کر اس زہریلے مادّے کو جسم سے باہر نکال سکتے ہیں۔

یہ ہیں وہ سوراخ اور انھیں کھولنے اور بند کرنے والی نادیدہ ڈوریاں جو وقتِ ضرورت کھلتی اور بند ہوتی رہتی ہیں اور جن کی طرف امام جعفر صادق علیہ السلام نے ساتویں صدی عیسوی میں انسانوں کو متوجہ فرمایا اور جن کے بارے میں امامؑ کے عہد سے صدیوں پہلے اور صدیوں بعد بھی کوئی انسان تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ قدرت کے ان انتظامات کے بارے میں جاننا تو بہت دور کی بات ہے۔

فالج یا دماغی امراض کی صورت میں پیشاب کو روکنا ممکن نہیں رہتا۔ جتنا پیشاب بنتا رہتا ہے اتنا ہی ہر وقت جسم سے نکلتا رہتا ہے۔ اسپتالوں میں آپ نے اکثر مریضوں کے بیڈ کے ساتھ پیشاب کی تھیلیاں لٹکی دیکھی ہوں گی، ان تھیلیوں میں پلاسٹک ٹیوبس ہوتی ہیں جنھیں براہِ راست مریض کے مثانے سے منسلک کیا گیا ہوتا ہے۔ (حوالہ: جسم کے عجائبات)

جسم سے فاضل مادّوں کا مناسب وقت پر اخراج اور ان پر انسان کا کنٹرول ہونا اللہ تعالیٰ کی کس قدر عظیم نعمت اور اس کی صنعت و حکمت کا کس قدر عظیم نمونہ ہے۔ لیکن انسان اللہ تعالیٰ کے

ان احسانات کو اس وقت تک محسوس نہیں کرتا جب تک ان میں کوئی خرابی یا خلل پیدا نہ ہو جائے۔

جو نہیں جانتے وہ زیادہ ہیں

امام علیہ السلام نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے آخر میں فرمایا:

"مفضل! یہ مادّے اگر بہتے ہی رہا کرتے تو انسان کی زندگی کس قدر تلخ اور ناگوار ہو جاتی! اسی طرح آدمی غور کرتا جائے تو بہت سی باتیں ہیں جنہیں شمار کرنے والا شمار کر سکتا ہے لیکن اللہ کے جن احسانات اور حکمتوں کو شمار نہیں کیا جا سکتا اور جنہیں انسان نہیں جانتے وہ ان سے کہیں زیادہ ہیں جنہیں وہ جانتے ہیں۔"

باب: 18

اعضاء کی موزونیت

انگریزی زبان میں ایک لفظ استعمال ہوتا ہے، کومپیٹ ایبل (Compatiable)۔ کمپیوٹر کے کئی پروگراموں یا ہارڈ ویئرز میں بھی اس لفظ کا استعمال عام ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ یہ پروگرام یا پارٹ فلاں کمپیوٹر میں چل سکتا ہے۔ فلاں میں کام نہیں کرے گا۔

چلیں آپ کو مزید سادہ سی مثال دیں مثلاً آپ انرجی سیور بلب خریدتے ہیں تو دکاندار آپ سے معلوم کرتا ہے کہ چوڑی والا چاہیے یا دوسرا؟ آپ اسے بتاتے ہیں کہ چوڑی والا چاہیے کیونکہ آپ کو معلوم ہے آپ کے بلب ہولڈر میں چوڑیاں بنی ہوئی ہیں۔ اگر آپ غلطی سے دوسری قسم کا بلب خرید لیں گے تو وہ ہولڈر میں نہیں لگے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ چوڑی والا بلب ہی آپ کے بلب ہولڈر کے ساتھ Compatiable ہے۔

اسی طرح آپ کے پاس DVD ہے تو یہ DVD پلیئر پر ہی چلے گی۔ اگر آپ اسے DVD پلیئر کی بجائے ٹوسٹر کے اندر ڈال دیں تو ظاہر ہے کہ یہ چونکہ ٹوسٹر سے Compatiable نہیں ہے تو ٹوسٹر اسے جلا تو سکتا ہے چلا نہیں سکتا۔

نوٹ: مرد اور عورت

انسانی جسم کے اعضاء اور مرد، خواتین کے الگ الگ اعضاء کو اللہ تعالیٰ نے اسی طرح ایک دوسرے کے لیے موزوں Compatiable بنایا ہے اور ان اعضاء کو سکڑنے اور پھیلنے والا، کھلنے اور بند ہونے والا تخلیق فرمایا ہے۔ بعض اعضاء کھلنے اور پھر بند ہو جانے والے پھولوں کی طرح ہیں اور بعض اعضاء شہد کی مکھی کی اسٹرا جیسی زبان کی طرح ہیں۔ شہد کی مکھی کی اسٹرا جیسی یہ زبان عام حالت میں اس کے منہ میں بند رہتی ہے لیکن وقتِ ضرورت یہ سیدھی ہو کر تن جاتی ہے۔ کام ختم

ہونے کے بعد یہ سمٹ کر واپس شہد کی مکھی کے منہ میں چلی جاتی ہے۔

شریعت اور سائنس کی زبان

نوٹ: اس موضوع پر امام جعفر صادق علیہ السلام کے ارشادات کو ہم نے متشابہات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ان اعضاء میں قدرت کی نشانیاں اور ان کی کارکردگی جاننا چاہیں تو ہماری کتاب ''جسم کے عجائبات'' کا مطالعہ فرمائیں۔بات دراصل یہ ہے کہ شریعت اور سائنس کی زبان بہت واضح اور دوٹوک ہوتی ہے تاکہ کسی حکم اور اصول کو سمجھنے میں کوئی ابہام پیدا نہ ہو لیکن عام قارئین کے لیے کتاب لکھتے وقت اس بات کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کوئی لفظ قاری کے ذوق مطالعہ پر گراں نہ گزرے۔امام علیہ السلام نے اعضائے تولید کے حوالے سے جو کچھ فرمایا، اسے ہمارے قارئین توحیدالائمہ یا توحید مفضل نامی کتاب میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

اس کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام نے اِثباتِ وجودِ خدا کے حوالے سے دلائل دیتے ہوئے مفضل ابنِ عمرؓ کو ان اعضاء کی خلقت اور کارکردگی کے بارے میں بھی بتایا جو ہمارے جسم سے زہریلے اور فاسد مادّوں کو باہر نکالنے کے ذمے دار ہیں۔

جسم کا ڈرینج سسٹم

امام علیہ السلام نے فرمایا:

''مفضل! ذرا اس بات پر بھی غور کرو کہ انسان کے کھانے پینے سے (جو زہریلے مادّے جسم میں پیدا ہوتے ہیں) ان کا جسم سے نکل جانا (انسان کے لیے) اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔

دیکھو مفضل! جب کوئی گھر تعمیر کیا جاتا ہے تو اس میں بیت الخلاء (ٹوائیلٹ) ایک خاص مقام پر بنایا جاتا ہے۔ (جہاں پردہ بھی

ہو اور جس جگہ سے غلاظتیں بہ آسانی گھر سے باہر نکل سکیں۔)

اسی طرح جسم کے (فاسد اور زہریلے، بدبودار) فاضل مادّوں کو جسم سے باہر نکالنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم میں نکاسی کی جگہیں ایسے مقامات پر بنائی ہیں جو بہت پوشیدہ ہیں۔ اخراج کی جگہیں ایسے مقام پر نہیں بنائیں جو ہر وقت نظر آتی ہوں۔"

فتبارک اللہ من تظاهرت الائمه و لاتحصیٰ نعمائه

تو مفضل! دیکھو کیا مادّے یا طبیعت میں یہ شعور ہو سکتا ہے کہ ہر عضو کو انسان کی سہولت کے مطابق ایک خاص مقام پر خلق کر سکے۔"

بدن کی چار قوتیں

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"اب میں تم سے ان چار قوتوں کا بیان کروں گا جو انسانی جسم کو عطا کی گئی ہیں (اور جسم کے مختلف اعضاء کی مدد سے کام کرتی ہیں یا مختلف اعضاء ان کی مدد سے کام کرتے ہیں)

۱۔ قوت جاذبہ: یہ قوت غذا کو جسم کے لیے قابلِ قبول بناتی ہے اور اسے معدے میں لے جاتی ہے۔

۲۔ قوتِ ماسکہ: یہ وہ قوت ہے جو غذا کو جسم میں روکتی

ہے تاکہ طبیعت (اللہ کی قدرت) اس غذا پر کام کر سکے۔ یہ قوت غذا کو جسم میں ٹھہراتی ہے۔ ورنہ غذا اور پانی استعمال کرتے ہی جسم سے باہر نکل جایا کرتا۔

۳۔ **قوتِ ھاضمہ**: یہ قوت غذا کو پکاتی ہے۔ قابل ہضم بناتی ہے اور اس کا لبِ لباب یا جوہر نکال کر اسے (دورانِ خون کے ذریعے) بدن میں پھیلا دیتی ہے۔

(اس کی مثال آنتوں کا غذا سے سارا پانی نکال کر غذائی اجزاء کو واپس خون میں شامل کر دینا ہے۔ اسی طرح چکنائی کا ایک دوسرے نظام کے تحت جسم میں پہنچنا ہے جس کی تفصیل آپ گزشتہ ابواب میں پڑھ چکے ہیں۔)

۴۔ **قوتِ دافعہ**: یہ وہ قوت ہے وہ جو غذا سے جوہرِ حیات نکلنے کے بعد فاضل مادّوں کو جسم سے دفع (خارج) کر دیتی ہے۔

''تو مفضل! انسان کو اپنے جسم میں موجود ان قوتوں پر غور کرنا چاہیے کہ انہیں کس نے بنایا اور کس حسن وخوبی کے ساتھ بنایا۔ انہیں اس لیے بنایا گیا کہ جسم کو ان کی ضرورت تھی۔ تم ان پر جس قدر غور کرو گے تو تمہیں ان میں خالقِ کائنات کی (اسی قدر زیادہ) حیران کن تدبیریں اور حکمتیں نظر آئیں گی۔''

بادشاہ اور خدمت گار

امام علیہ السلام نے فرمایا:

''میں تم سے ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ دیکھو! مثلاً انسان کا جسم تو ایک بادشاہ کا مکان ہے۔ اس مکان میں اس کے بچے اور اس کے خاص خدمت گار رہتے ہیں۔ اسی مکان میں کئی نوکر چاکر بھی ہیں جو اس مکان کے سارے کاموں کو سرانجام دینے کے ذمے دار ہیں۔

(۱) مثلاً ایک نوکر کا کام ہے کہ وہ ضروری چیزوں کو جمع کرے اور ان خاص خدمت گاروں کے پاس رکھے۔

(۲) دوسرے کا کام یہ ہے کہ جو کچھ آیا ہے اس کو لے جائے اور جمع کرے تا کہ ان چیزوں کی اصلاح ہو سکے اور انہیں کھانے کے لائق بنایا جا سکے۔

(۳) تیسرے نوکر کا کام یہ ہے کہ وہ اسے درست کرے، کھانے کے لیے تیار کرے اور ہر ایک کو تقسیم کرے۔

(۴) چوتھے ملازم کی ذمے داری ہے کہ گھر کی صفائی کا خیال رکھے اور گھر میں جو کوڑا کرکٹ جمع ہو گیا ہے اسے مکان سے جمع کر کے گھر سے دور کوڑے کے ڈھیر پر لے جا کر پھینک دے۔

اب دیکھو!'' اس مکان (جسم انسانی) کا مالک و بادشاہ تو

خلاق علیم ہے جو تمام عالموں کا مالک ہے اور مکان .....مکان یہ
جسم ہے اور اس کے خاص خدمت گار یہ اعضاء ہیں اور نوکر چاکر یا
ملازم یہی چار قوتیں ہیں جن کا میں نے تم سے بیان کیا ہے"۔

(اور انسان اس مکان میں کرائے دار کی سی حیثیت سے رہتا ہے۔ البتہ اسے کوئی کرایہ ادا نہیں کرنا پڑتا اور شاید اسی لیے بھول جاتا ہے۔ کہ یہ مکان اس کا ذاتی مکان نہیں ہے۔ ایک دن اسے اس مکان کو خالی بھی کرنا ہے!)

میرا بیان اس طرح کا نہیں

"مفضل! تم شاید میری ان باتوں کو جو میں نے تمہیں بدن
کی چار قوتوں کے بارے میں بتائی ہیں غیر ضروری یا بے سبب
خیال کرو کیونکہ یہ عام سی باتیں ہیں جو طبیبوں اور حکیموں کو بھی
معلوم ہیں لیکن میرا بیان اس طرح کا نہیں ہے اور نہ میری گفتگو
کا مقصد وہ باتیں بتانا ہے جو اطباء کی کتابوں میں لکھی گئی ہیں
اور جن کی انہیں بیماریوں کو دور کرنے یا علاج معالجے کے لیے
ضرورت پڑتی ہے۔ میں نے یہ باتیں اس مقصد کے لیے نہیں
بتائیں۔ میں نے ان چار قوتوں کا بیان اس مقصد سے کیا ہے
جس کی ضرورت دین کی اصلاح اور گمراہوں کو راہ دکھانے کے
لیے پڑتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ خود بہ خود پیدا ہو گیا۔
اس کا پیدا کرنے والا کوئی نہیں۔

اس کی مثال میرا وہ بیان اور مثال ہے جس میں میں نے "تدبیر اور حکمت" کو واضح کیا تھا۔"

نوٹ: تدبیر سے کیا مراد ہے؟

اس عنوان کے تحت امام علیہ السلام نے انسان کی خلقت کے ابتدائی مراحل کو بیان کیا تھا اور بتایا تھا کہ حمل ٹھہرنے کے بعد "تدبیر" الٰہی ہوتی رہتی ہے۔ امام علیہ السلام کے اس جامع کلام کی مختصر سی وضاحت ہم گزشتہ ابواب میں جینیٹک سائنس کی مدد سے قارئین کی خدمت میں پیش کر چکے ہیں۔

حافظہ، نسیان اور شرم وحیا

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"مفضل! ذرا غور کرو ان صلاحیتوں کے بارے میں جنہیں نفسِ انسانی میں رکھا گیا ہے۔ میرا مطلب ہے حافظہ، نسیان (بھول جانا) اور شرم وحیا۔

دیکھو اگر ان میں سے صرف قوت حافظہ ہی انسان میں نہ ہوتو اس کا کیا حال ہوگا۔ اس کے کاموں میں کس قدر خلل پیدا ہوگا۔ وہ تجارت لین دین وغیرہ کس طرح کر سکے گا۔ اسے یاد ہی نہیں رہے گا کہ اس کا دوسروں پر کیا آتا ہے، دوسروں کا اسے کیا دینا ہے۔

کب کس سے کیا لیا تھا، کیا دیا تھا، کیا سنا تھا، کیا وعدہ کیا تھا؟ کس نے اس پر احسان کیا تھا اور کس نے اس کے ساتھ

برائی کی تھی۔ کس چیز نے اسے فائدہ پہنچایا تھا اور کس چیز نے نقصان۔

پھر وہ اگر راستہ چلتا تو وہ راستہ اسے یاد ہی نہ رہتا، اگر پڑھتا تو کسی علم کو یاد کس طرح رکھ پاتا۔ وہ نہ کسی دین کی اچھائیاں یاد رکھ کر اس پر قائم رہ سکتا تھا۔ نہ کسی تجربے سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ نہ کسی گزشتہ چیز پر کسی موجودہ چیز کو قیاس کر سکتا تھا کہ اسے پہلے کہاں دیکھا تھا اور یہ کیا ہے؟

تو دیکھو کہ صرف یہ ایک ہی صلاحیت کس قدر انمول اور ضروری ہے کہ اگر صرف یادداشت نہ رہے تو زندگی کس قدر بدمزہ ہو جائے گی۔ کس قدر دشواریاں اس کے کاموں میں حائل ہو جائیں گی اور وہ زندگی سے تنگ آ جائے گا۔"

بھول جانا بھی ایک نعمت

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"اور دیکھو! حافظے سے بھی بڑھ کر جو نعمت انسان کو ملی ہے وہ ہے نسیان (یعنی بھول جانے کی صلاحیت) اگر نسیان نہ ہوتا تو آدمی کو اپنی کسی مصیبت پر کبھی صبر و سکون ہی نہ مل پاتا اور نہ کبھی وہ اپنی محرومیوں پر صبر کر سکتا تھا۔ نہ اس کی کوئی خواہش کبھی دھیمی

پڑتی (مثلاً اسے اپنے گھر، کار، دولت یا کسی اور چیز کی خواہش ہوتی تو یہ خواہش کسی لمحے کم نہ ہوتی۔ کسی سے انتقام لینا ہوتا تو وہ ہر وقت اس آگ میں جلتا رہتا)

اس کے نتیجے میں وہ دنیا کی لذتوں سے فائدہ ہی نہ اٹھا پاتا اس لیے کہ اسے اپنی مصیبتیں اور حسرتیں ہمیشہ یاد رہتیں۔ نہ اسے حکمرانوں کے بھول جانے اور حاسدوں کے حسد سے رکنے کی کوئی امید رہتی۔ (اسے ہر وقت یاد رہتا کہ میں نے فلاں غلط کام کیا تھا کسی وقت بھی پکڑا جاؤں گا) اسے یاد رہتا کہ فلاں غلطی میں نے کی تھی تو سزا دینے والا اسے بھولے گا نہیں۔ اسی طرح حسد کرنے والوں اور اس کے ساتھ زیادتی کرنے والوں کی باتیں وہ کسی لمحے بھول ہی نہ پاتا اور اس طرح اس کی زندگی تلخ ہو کر رہ جاتی۔"

متضاد لیکن مفید

"تو مفضل! کیا تم نہیں دیکھتے کہ یہ دونوں صلاحیتیں یعنی حافظہ اور نسیان جو ایک دوسرے کے متضاد ہیں کس طرح انسان میں پیدا کی گئی ہیں اور ان میں کس قدر مصلحتیں اور حکمتیں ہیں (جن سے ہر انسان فائدہ اٹھاتا ہے) حافظہ اور بھول دونوں ایک دوسرے کے برعکس ہیں لیکن تم دیکھو کہ دونوں ہی انسان کو کس طرح فائدہ پہنچاتی ہیں۔ دونوں میں انسان کے لیے فائدہ ہی

فائدہ ہے۔

اب دیکھو کہ کچھ لوگوں کا نظریہ واعتقاد ہے کہ تمام اشیائے عالم کے دو الگ الگ خالق ہیں۔" (مانویہ فرقے کے لوگوں کا اعتقاد ہے کہ سودمند چیزوں کو الگ خدا نے پیدا کیا اور نقصان دہ چیزوں کا خالق کوئی اور ہے)

کیا حافظہ اور نسیان، الگ الگ خداؤں کی تخلیق ہیں؟

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"نسیان یا بھول جانا بہ ظاہر نقصان دہ چیز ہے اور حافظہ ایک سودمند صلاحیت ہے تو دو الگ الگ خداؤں کو ماننے والے ان دونوں متضاد، ایک دوسرے کے برعکس صلاحیتوں کو اگر دو الگ الگ خداؤں کی تخلیق سمجھیں تو یہ غلط ہوگا کیوں کہ دونوں ہی صلاحیتیں انسان کو فائدہ پہنچاتی ہیں۔ دونوں میں نفع ہی نفع ہے۔ دونوں میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ شر پیدا کرنے والا "خدا" خیر پیدا ہی نہیں کرسکتا ہے جیسا کہ خود ان کا نظریہ ہے۔

تم یہ بھی دیکھو مفضل کہ حافظہ اور نسیان کس قدر عظیم الشان نعمتیں ہیں اور انہیں کس طرح انسان میں خلق کیا گیا۔"

(تو کیا کسی حکیمِ مطلق کے ارادے کے بغیر انسانی وجود میں ایسی صلاحیتیں پیدا ہوسکتی تھیں۔ مادّہ یا نیچر انسان کی زندگی کے لیے ضروری ان باتوں کا خیال رکھ سکتے تھے؟)

نوٹ: حافظہ اور نسیان میڈیکل سائنس کی نظر سے

انسان پیدا ہونے کے پہلے لمحے سے لے کر اپنے آخری سانس تک اپنے اردگرد کے ماحول سے جو بھی معلومات حاصل کرتا ہے وہ اپنے پانچ حواسوں کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔ ان پانچ حواسوں یا حاسوں (یعنی اعضاء) کا کام اردگرد کے ماحول سے معلومات جمع کر کے انہیں دماغ کی طرف روانہ کرنا ہے۔

آنکھیں اردگرد کی ہر چیز کو ہر وقت اسکین کرتی رہتی ہیں اور ان کی تصاویر برقی کیمیائی سگنلز کی شکل میں دماغ کو ارسال کرتی رہتی ہیں۔ کان، اردگرد کی آوازوں کو جمع کر کے انہیں دماغ تک پہنچاتے ہیں۔ زبان ذائقوں کی اطلاع دماغ کو فراہم کرتی ہے۔ ناک خوشبوؤں یا بدبوؤں کے بارے میں ہر لمحہ دماغ کو اطلاعات فراہم کرتی ہے۔

ہماری جلد میں موجود اعصابی نظام اردگرد کے ماحول کے درجۂ حرارت، روشنی، تاریکی، چیزوں کی نرمی اور سختی کے بارے میں دماغ کو اطلاع دیتا رہتا ہے۔ مثلاً جس بیڈ یا کرسی پر آپ بیٹھے ہیں یا جس چیز کو آپ چھو رہے ہیں وہ نرم ہے یا سخت، گرم ہے یا ٹھنڈی؟ آپ کے اردگرد اندھیرا ہے یا چمکتی ہوئی دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ یہ سب تفصیلات ہر لمحے ہمارا اعصابی نظام دماغ کو فراہم کرتا ہے۔ یہی نظام جسم کی اندرونی ضرورتوں، دردوں اور تکلیفوں کے بارے میں بھی دماغ کو اطلاعات فراہم کرتا رہتا ہے۔

دماغ ہر لمحہ بیرونی دنیا سے اپنی طرف آنے والی لاکھوں معلومات کو برقی کیمیائی سگنلز کی شکل میں وصول کرتا ہے۔ پھر انہیں ''اپنی زبان'' میں تبدیل کر کے ڈی کوڈ کرتا ہے اور ضروری معلومات پر جسم کے اعضاء کو اس مخصوص صورتِ حال کے تدارک کے لیے فوری احکامات صادر کرتا ہے۔

مثلاً آپ کا پاؤں موزیک کے فرش پر پھسلنے لگتا ہے تو پاؤں میں موجود مواصلاتی نظام اس کی فوری اطلاع دماغ کو فراہم کرتا ہے۔ اسی وقت آپ کے کانوں میں توازن کو برقرار رکھنے والا نظام دماغ کو اطلاع فراہم کرتا ہے کہ جسم (مثلاً) دائیں طرف گر رہا ہے۔ دماغ فوراً ہی جسم کے بائیں

حصے کے پٹھوں کو کھینچ جانے کا حکم صادر کرتا ہے اور یہ پٹھے جسم کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اس طرح آپ گرتے گرتے سنبھل جاتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کوئی شخص بے اختیار منہ کے بل سامنے کی طرف گر جائے تب بھی دماغ ہاتھوں کو حکم دیتا ہے اور ہاتھ، چہرے سے پہلے زمین پر ٹک جاتے ہیں اور چہرہ زخمی ہونے سے محفوظ رہتا ہے۔

آپ کے فرش پر پھسلنے کی تمام تر تفصیلات کو دماغ اپنے پاس محفوظ کر لیتا ہے اور آئندہ جب آپ موزیک کے فرش پر قدم رکھتے ہیں تو دماغ آپ کو گزشتہ تجربے کی تمام تفصیلات سے آگاہ کر دیتا ہے اور اب آپ احتیاط سے قدم اٹھاتے ہیں۔

اسی طرح جب آپ کو اذان کی آواز آتی ہے تو دماغ آپ کو نماز کے بارے میں یاد دلاتا ہے اور آپ مسجد کا رخ کرتے ہیں اور جب آپ چلتے چلتے فائرنگ کی آواز سنتے ہیں تو جھک جاتے ہیں اور چھپنے کی جگہ تلاش کرنے لگتے ہیں۔

آپ کسی دوست، دشمن، کسی رشتے، کسی شے، کسی دوا، غذا، مشروب کو دیکھیں یا اس کا نام سنیں تو دماغ ان سے متعلق تمام تر تفصیلات اور تجربات آپ کو یاد دلا دیتا ہے۔ اگر یہ یادداشت اور حافظہ نہ ہوتا تو مشکلات کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔

اس سے حیران کن معاملہ نسیان کا ہے

دماغ کے اندر یہ صلاحیت بھی موجود ہے کہ وہ آپ کے لیے انتہائی ضروری، ضروری، غیر ضروری اور غیر اہم معلومات کو الگ الگ اسٹور کر سکے۔ انتہائی ضروری معلومات اور ضروری معلومات ذہن میں ہر وقت تازہ رہتی ہیں۔ غیر ضروری، غیر اہم، تکلیف دہ یادوں، باتوں اور تجربات کو دماغ بتدریج آپ کی فوری پہنچ سے دور کرتا رہتا ہے۔

ہم اور آپ اپنے دکھوں، اپنی ذلتوں، تکلیفوں اور اذیت ناک تجربات کو بتدریج بھولتے جاتے ہیں۔ اسی کو صبر آنا کہا جاتا ہے۔ یہ ساری تکلیف دہ یادیں ہمیشہ کے لیے محو نہیں ہوتیں؛ کہیں محفوظ رہتی ہیں لیکن آپ کی فوری پہنچ سے دور۔

اگر دماغ میں یہ صلاحیت نہ ہوتی تو آدمی اپنی ذلت کو کبھی نہ بھول پاتا۔ ماں اپنے مرنے والے بچے کا غم کبھی نہ فراموش کر پاتی۔ جن مشکلات سے کبھی ہم گزرے تھے ان کی اذیتیں ہم کبھی نہ بھول پاتے۔ انتقام کا جذبہ دماغ میں طوفان اٹھائے رکھتا اور زندگی جہنم بن کر رہ جاتی۔

(اقتباس: جسم کے عجائبات)

باب : 19

گفتگو کی صلاحیت اور اللہ کی حکمتیں

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"مفضل! غور کرو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ایک اور عظیم نعمت پر، جس کے ذریعے انسان اپنے باطنی خیالات، حاجت، تکلیف، خوشی، غم، ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات اور اپنی کیفیات کو دوسرے سے بیان کر سکتا ہے اور یہ نعمت ہے بولنے اور گفتگو کرنے کی (اَن مول) صلاحیت۔ اگر یہ نعمت انسان کے پاس نہ ہوتی تو یہ دوسرے حیوانوں کی طرح ہوتا جو نہ اپنے دل کی بات کسی سے کہہ سکتے ہیں اور نہ دوسری کی بات سمجھ سکتے ہیں۔"

(یعنی نہ وہ ہماری بات سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہم ان کی بات کو سمجھ سکتے ہیں)

نوٹ: **بولنا اور اسے سن کر سمجھنا**

جس طرح گفتگو کرنے کی صلاحیت اللہ رب کریم کی عظیم نعمت ہے اسی طرح گفتگو کو سننا اور اسے سمجھنا بھی اللہ تعالیٰ کے عظیم احسانات میں سے ہے۔ یہ دونوں صلاحیتیں ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں۔

یعنی اگر بولنے کی صلاحیت ہوتی لیکن اس گفتگو کو سننے اور سمجھنے والا کوئی نہ ہوتا، اسی طرح سننے اور سمجھنے کی صلاحیت انسان میں موجود ہوتی اور بولنے یا گفتگو کرنے والا کوئی نہ ہوتا تو دونوں ہی صلاحیتیں موجود ہونے کے باوجود انسان کے لیے بیکار ہوتیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو

دونوں ہی صلاحیتوں سے بیک وقت نوازا ہے۔ان دونوں صلاحیتوں کا بیک وقت موجود ہونا اور ایک دوسرے سے ہم آہنگ (Compatiable) ہونا بھی اللہ کی عظیم نشانیوں میں سے ہے۔

نوٹ: بولنے کے عجائبات

بولنے اور سننے کے عمل کی سائنسی تشریح ہم گزشتہ ابواب میں پیش کر چکے ہیں کہ یہ حیران کن عمل کس طرح وقوع پذیر ہوتے ہیں۔آپ ان کے بارے میں تفصیل جاننا چاہیں تو گزشتہ ابواب دیکھیے اور تفصیلات کے متلاشی ہوں تو ہماری کتاب ''جسم کے عجائبات'' کا مطالعہ فرمایئے۔

تحریر کی صلاحیت

گفتگو کرنے کی صلاحیت کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل ابن عمرؓ کو لکھنے پڑھنے کی صلاحیت کی طرف متوجہ فرمایا۔

''مفضل تم غور کرو، تو دیکھو گے کہ لکھنے (پڑھنے) کی صلاحیت بھی انسانوں پر اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم احسان ہے، جس کے ذریعے گزشتہ زمانے کے افراد (علوم، تہذیبوں اور معاشروں) کے حالات سے آگہی حاصل ہوتی ہے اور موجودہ زمانے کے لوگوں کے حالات مستقبل میں آنے والوں کے لیے ضبطِ تحریر میں لائے جاتے ہیں۔

تحریر ہی کے ذریعے مختلف علوم و آداب کی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ گفتگوؤں، معاہدوں اور حساب کتاب کو بھی تحریر ہی کے ذریعے ایک عہد سے دوسرے عہد اور ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کیا جاتا ہے۔

لکھنے اور قلم بند کرنے کی یہ صلاحیت نہ ہوتی تو ایک عہد کی تاریخ دوسرے عہد تک منتقل نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک زمانے کی خبریں دوسرے زمانے سے بالکل منقطع ہو جاتیں۔ علوم معدوم ہو جاتے، تہذیبوں کے حالات تلف ہو جاتے، جو لوگ اپنے وطن سے دور ہیں انہیں اپنے گھر کی خبر ملتی اور نہ وطن میں موجود لوگوں کو سفر پر جانے والوں کی خیریت!

اسی طرح دینی معاملات کے ساتھ ہوتا کہ دین کے احکامات، آداب، روایات، تعلیمات، دوسرے زمانے میں مفقود ہو جاتیں، ان میں خلل واقع ہوتا اور جن چیزوں کا جاننا ضروری ہے ان کا جاننا ممکن نہ رہتا۔"

کیا انسان خود بہ خود بولنا اور لکھنا سیکھ گیا؟

"مفضل! ممکن ہے تم سوچو کہ لکھنے (اور پڑھنے) کی ان صلاحیتوں کو انسان نے اپنی کوشش، تجربے اور ذہانت کے ذریعے حاصل کر لیا ہے۔ یہ چیزیں انسان کی طبیعت و فطرت میں پیدا نہیں کی گئی ہیں؟ اسی طرح مختلف فرقوں (یعنی قوموں) کی زبانیں ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ زبانوں کی طرح تحریریں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مثلاً عربی، سریانی، رومی (انگریزی) اور عبرانی رسم الخط ہیں۔

اب اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ یہ زبانیں اور تحریریں انسانوں نے خود بہ خود اپنے اپنے تجربات سے بنالی ہیں تو اسے جواب دیا جائے گا کہ اگرچہ دونوں کاموں میں انسان کی کوشش اور عمل کو دخل ہے لیکن جس چیز کے ذریعے انسان اس تدبیر فعل اور کامیابی تک پہنچا کہ لکھ، پڑھ، سن اور بول سکے وہ یقیناً عطیۂ خداوندی ہے اور اس کے اسباب و آلات کو اللہ رب کریم نے ان کے جسم اور فطرت میں پیدا کیا ہے۔

مثلاً دماغ، عقل اور اعضاء۔ تو اگر عقل نہ ہوتی، دماغ نہ ہوتا تو انسان کسی چیز کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر زبان نہ ہوتی جس سے وہ گفتگو کرتا اور ذہن نہ ہوتا جس کے ذریعے وہ سوچ کر بولتا تو زبانیں کس طرح وجود میں آتیں؟

اسی طرح اگر سوچنے سمجھنے کی بیش بہا صلاحیت کے ساتھ ساتھ اسے (خاص طرح کے) ہاتھ اور انگلیاں نہ دی گئی ہوتیں تو وہ قلم کس طرح تھامتا اور کس طرح لکھنے کے قابل ہوتا۔"

نوٹ: ہاتھوں کی جلد، انگلیاں اور انگوٹھا

پھیپھڑوں سے نکلنے والی ہوا، حلق کے اندر موجود "ووکل کورڈز" اور پھر منہ میں آکر تالو، دانتوں، زبان اور ناک کی مدد سے کس طرح ایک بامعنی لفظ یا جملے میں تبدیل ہو جاتی ہے؟ اس کی کسی قدر تفصیل ہم گزشتہ ابواب میں پیش کر چکے ہیں۔ انہی ابواب میں ہم دماغ اور ہاتھوں یا

انگلیوں کے درمیان باہمی رابطوں کے بارے میں بھی قارئین کو میڈیکل سائنس کی روشنی میں کسی حد تک بتا چکے ہیں۔ یہاں صرف ہم کھلنے اور بند ہونے والی انگلیوں، انگوٹھے اور ہاتھوں کی جلد کے بارے میں عرض کریں گے۔

لکھنے کے عمل میں کئی باتیں قابلِ توجہ ہیں۔ مثلاً ہاتھوں کی جلد۔ ہاتھوں کی وہ جلد جو ہتھیلی کی سمت ہے قدرت کے عجائبات میں سے ہے۔ اس جلد کو اگر آپ محدّب شیشے سے دیکھیں تو پتا چلے گا کہ اس جلد پر باریک باریک لائنیں موجود ہیں (یہ لائنیں آپ ہاتھ یا انگلیوں کا پرنٹ بنا کر بھی دیکھ سکتے ہیں)

اس کے ساتھ ساتھ ہتھیلی کی سمت والی کھال میں ایک خاص طرح کی نمی ہر وقت موجود رہتی ہے جو قلم یا دوسری چیزوں کو مضبوطی سے پکڑنے میں آپ کی مدد کرتی ہے۔ سخت سردی میں یہ نمی غائب ہو جاتی ہے۔ اسی لیے اس زمانے میں ہاتھ کی گرفت یا پکڑ معمول کے مطابق نہیں ہوتی۔

اس کے علاوہ آپ کوئی بھی چیز مثلاً قلم، بیٹ، کار کا اسٹیئرنگ یا قلم پکڑتے ہیں تو انگلیوں اور انگوٹھے کی مدد سے پکڑتے ہیں۔ آپ کوئی سوئی یا پن بھی انگلیوں اور انگوٹھے کے بغیر نہ اٹھا سکتے ہیں نہ پکڑ سکتے ہیں۔ دراصل انگوٹھا اور انگلیاں مل کر کسی پلاس کی طرح کام کرتے ہیں۔

اگر کسی شخص کا انگوٹھا کسی حادثے میں کٹ جائے تو اس کے لیے کسی بھی چیز کو اٹھانا، پکڑنا یا کام کرنا ممکن نہیں رہے گا۔ انگوٹھا اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو ہتھیلی کی حیران کن جلد اور چاروں انگلیاں مل کر بھی وہ کام سرانجام نہیں دے سکتی تھیں جو کام انگوٹھے کی موجودگی میں بہ آسانی سے سرانجام دیئے جاتے ہیں۔

ممکن ہے آپ کے ذہن میں خیال آئے کہ جدید زمانے میں کی بورڈ (Key Board) کے ذریعے صرف ایک انگلی یا انگوٹھے سے لکھا جا سکتا ہے۔ یہ بات درست ہے لیکن پھر وہی سوال سامنے آئے گا کہ انسان کو یہ عقل کس نے عطا کی کہ وہ لکڑی کی تختی یا ٹین کی سلیٹ سے کی بورڈ (Key Board) یا آئی پیڈ (Ipad) تک پہنچ سکے!

دوسرے جانداروں کو دیکھو

امام علیہ السلام نے تحریر و کلام جیسی نعمتوں کے حوالے سے مفضل ابن عمرؓ سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:

"مفضل! اس بات (یعنی تحریر، تقریر) کی اہمیت و افادیت سمجھنے کے لیے دوسرے جانداروں کو دیکھو جن میں نہ (بامعنی) کلام کی طاقت ہے، نہ ان کے پاس ایسے اعضاء ہیں کہ وہ کوئی چیز تحریر کر سکیں۔

(قابلِ توجہ بات یہ بھی ہے کہ چمپینزی بندر انسان سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ ان کے پاس دماغ، ہاتھ پیر انگلیاں، منہ زبان حلق سب کچھ موجود ہیں لیکن لکھنا تو درکنار وہ صرف وہی آواز نکال سکتے ہیں جسے دوسرے بندر سمجھ سکیں۔)

اللہ کا خاص احسان

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"اس سے معلوم ہوا کہ یہ باری تعالیٰ جلّ شانہ کا قانونِ فطرت ہے جس پر انسان کو پیدا کیا گیا اور یہ انسانوں پر ایک احسان ہے..... تو جو کوئی اس کا شکر ادا کرے گا، اسے ثواب ملے گا اور جو کفرانِ نعمت کرے گا تو اللہ کو اس کی کوئی پروا نہیں ہے کیوں کہ اللہ جل شانہ تمام جہان سے مستغنی ہے۔ (نہ ہمارا شکر اس کی عظمت میں اضافہ کر سکتا ہے اور نہ ہماری ناشکر گزاری اس کی عظمت کو کم کر سکتی ہے۔)

انسان کو وہ علم دیا گیا جو اس کے لیے ضروری ہے

"مفضل! یہ بھی دیکھو کہ انسان کو ان سب چیزوں کا علم دیا گیا ہے جن میں اس کے دین اور دنیا کی بھلائی ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی معرفت، جو دلیلوں اور شہادتوں کے ذریعے (عقلی بنیادوں پر) حاصل کی جائے، اس کے ساتھ ان تمام کاموں کی معرفت جو اس پر واجب ہیں۔

مثلاً انصاف کرنا اور اسے پسند کرنا، والدین کے ساتھ نیکی کرنا، محتاجوں کی مدد کرنا، اچھائی کو پسند کرنا، برائی کو ناپسند کرنا، یہ سب باتیں انسان کی فطرت و ضمیر میں رکھ دی گئی ہیں۔ یہ وہ صفات ہیں جو تمام امتوں اور مذاہب میں فطرتاً موجود ہیں خواہ وہ ہمارے مخالف ہوں یا موافق۔

اسی طرح انسان کو ان تمام کاموں اور چیزوں کا بھی علم عطا کیا گیا جن میں اس کی دنیا کی بھلائی ہے۔ مثلاً زراعت، باغبانی، زمینوں کا آباد کرنا، مویشی پالنا، زمین میں کنویں کھودنا، پانی کے چشموں کو استعمال کرنا، جڑی بوٹیوں کی شناخت جن سے امراض کا علاج کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جواہرات (یا سونے چاندی) کی کانوں کی پہچان، کشتی پر سوار ہونے (یعنی کشتی چلانے)، دریا میں غوطہ خوری کرنے، جنگلی جانوروں چوپائیوں اور پرندوں

کا شکار، مچھلیوں کو پکڑنے کے طریقے، صنعت و حرفت اور اس میں طرح طرح کی تدبیریں، تجارت اور معیشت اور حساب کتاب کا علم اسے دیا گیا۔

ان کے علاوہ بے شمار علوم ہیں جنہیں بیان کیا جائے تو بات لمبی ہو جائے گی۔ غرض انسان کو وہ علوم دیے گئے یا طریقے بتائے گئے جو اس کی دنیا اور آخرت کی کامیابی کے لیے ضروری ہیں۔

زیادہ تعداد اُن باتوں کی ہے......

"لیکن مفضل! زیادہ تعداد ان باتوں (علوم) کی ہے جن کا جاننا انسان کی طاقت سے باہر ہے اور نہ اس میں اس قدر طاقت و صلاحیت ہے (کہ وہ کائنات کے ان سربستہ رازوں کو سمجھ سکے)۔ تو ایسی چیزوں کا علم انسان کو نہیں دیا گیا۔ مثلاً جو رحم مادر میں ہے یا جو کچھ لوگوں کے دلوں میں ہے۔ اس کے علاوہ علم غیب، یا بعض وہ چیزیں جو پہلے ہو چکی ہیں جیسے آسمان کے اوپر اور زمین کے نیچے کی چیزوں کا جاننا اور جو دریاؤں کے اندر ہیں اور کائنات میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔

(تو یہ علم کی تقسیم بھی یہ ظاہر کرتی ہے کہ کوئی منصوبہ ساز ہے جس نے یہ ساری باتیں اپنی مصلحت و مشیت کے مطابق طے کی ہیں اور انسانوں کے لیے ان کا حصول آسان کر دیا ہے)

نوٹ: علم کی حد کیا ہے؟

علوم بے شمار ہیں اور انسانی عقل سب کو سمجھنے سے ہمیشہ معذور رہے گی۔ بہرحال خود عقل بھی وقت، زمانے، تجربات و مشاہدات کے ساتھ بڑھتی رہتی ہے۔ انسان کے علم میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ سو سال پہلے انسان جن کاموں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، ان کا سرانجام دینا آج ایک معمول کی بات ہے لیکن علمِ الٰہی، علمِ غیب انسان کے لیے ہمیشہ لامحدود رہے گا اور ناقابلِ حصول بھی۔

اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ کائنات میں سو کھرب کہکشائیں موجود ہیں جن میں سے ہماری کہکشاں (ملکی وے) یعنی دودھیا کہکشاں میں سورج جیسے سوارب ستارے موجود ہیں۔ اس کہکشاں میں، ہمارے نظامِ شمسی کی مثال صحرا میں ایک ذرّے سے بھی کم تر ہے۔

انسان نامی یہ مخلوق اس نظامِ شمسی کے صرف ایک سیارے یعنی زمین پر پائی جاتی ہے۔

سائنس دان اپنی تمام تر سائنسی ترقی کے باوجود ابھی تک نظامِ شمسی کے صرف دو سیاروں، چاند اور مریخ تک کسی قدر رسائی حاصل کر سکے ہیں۔ دودھیا کہکشاں اور دوسری سو کھرب کہکشاؤں میں کیا ہے، اسے معلوم کرنے کا ابھی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ (فلکیات کے حوالے سے مزید معلومات آپ امام علیہ السلام کے تیسرے لیکچر میں تفصیل سے ملاحظہ کر سکیں گے)

آج کے زمانے کی جدید ترین دوربینیں جو زمین کے باہر خلا میں تیر رہی ہیں اور صرف تیس کروڑ نوری سال (لائٹ ایئرز) تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اس ناقابلِ تصور فاصلے کے بعد بھی انہیں کائنات کا اختتام نظر نہیں آتا۔ اس آخری حد پر روشنی کے عظیم مراکز کی روشنی کے تجزیے سے پتا چلا ہے کہ وہاں جو کچھ ہے وہ یہاں (یعنی نظر آنے والی کائنات) سے بالکل مختلف ہے۔

خلائی سائنس دانوں نے اسے "ایک متوازی کائنات (The Parallel Universe)" کا نام دے رکھا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا قول ہے:

''خداوندِ عالم نے ایک لاکھ قندیلیں پیدا کی ہیں اور انہیں معلّق کر دیا ہے۔ عرش اور تمام آسمان و زمین اور ان میں جو کچھ ہے حتیٰ کہ جنت و جہنم بھی ایک قندیل کے حلقے میں واقع ہیں۔ باقی قندیلوں میں جو کچھ ہے اسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔'' (حوالہ: انوار النعمانیہ)

امیر المومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ ''علم (بہ قدر) تین بالشت ہے جو پہلی بالشت تک پہنچا وہ متکبر ہو گیا۔ جو دوسری بالشت تک پہنچا اس نے انکساری اختیار کی اور جس نے تیسری بالشت تک رسائی حاصل کر لی تو اسے وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اسے کچھ معلوم نہیں۔''

واضح رہے کہ علمِ غیب ان سب سے ماوراء اور بالاتر ہے۔

باب: 20

اگر علم غیب بھی انسانوں کو دے دیا جاتا!

امام علیہ السلام نے مفضل بن عمر سے اثباتِ وجود خدا کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا۔

"دیکھو مفضل! انسان کو ان تمام چیزوں کا علم دیا گیا جس کی اسے دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے ضرورت تھی۔ اور یہ بھی دیکھو! کہ اس کے برعکس اسے بے شمار لاتعداد چیزوں کو جاننے سے روک دیا گیا، تاکہ اسے اپنی حیثیت کا احساس ہو جائے۔ اس میں غرور و تکبر نہ پیدا ہو۔

اب دیکھو! ان دونوں ہی باتوں میں اس کے لیے بہتری ہے اور اس میں اس بات کی بھی واضح دلیل موجود ہے کہ اس کا کوئی خالق ہے جس نے ایک منصوبہ کے تحت اسے کچھ علم عطا کیا اور بے شمار علوم سے اسے محروم رکھا۔

اگر اسے تمام کائنات کا علم دے دیا جاتا۔ اسے ماضی حال اور مستقبل کے حالات و واقعات، حادثات اور ان سے بچنے کا علم بھی دے دیا جاتا تو وہ پھر خود ہی کو خدا سمجھنے لگتا اور اپنے سے برتر ذات یعنی اللہ تعالیٰ کے آگے سر کیوں جھکاتا؟

اب اسے معلوم ہے کہ وہ ایک ناقص وجود ہے۔ نہ اسے اپنی زندگی کا پتا ہے، نہ موت کا۔ نہ وہ بیماری کو روک سکتا ہے۔ نہ صحت حاصل کرنا اس کے بس میں ہے۔ (نہ وہ حوادث کو روک سکتا ہے، نہ زمین و آسمان کی گردش کو)۔

مدتِ حیات کا علم کیوں نہیں دیا گیا؟

"مفضل کیا تم نے کبھی سوچا کہ انسان کو اس کی مدت حیات کا علم کیوں نہیں دیا گیا اور اگر اسے اپنی عمر اور موت کا علم دے دیا جاتا تو انسان کی زندگی کس قدر تلخ ہو جاتی۔

مثلاً اگر اسے معلوم ہوتا کہ میں فلاں سال فلاں تاریخ، فلاں وقت، فلاں بیماری، حادثے یا قدرتی آفت کے سبب مر جاؤں گا۔ تو ایسا انسان مرنے سے پہلے مر جایا کرتا۔

اور اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس کی زندگی کی مدت طویل ہے تو اسے اپنی بقا پر بھروسا ہو جاتا اور اس خیال سے گناہ کرتا رہتا کہ آج تو لذت حاصل کرلوں، فائدہ حاصل کرلوں، پھر مرنے سے اتنے دن پہلے توبہ کرلوں گا۔

یہ درست ہے کہ اللہ کی رحمت وسیع ہے اور وہ مرنے سے پہلے بھی بندے کی توبہ قبول کرتا ہے لیکن یہ بات باری تعالیٰ کو پسند نہیں کہ لوگ اس طرح سوچیں اور سوال یہ بھی ہے کہ کیا ضروری

ہے کہ بندے کو مرنے سے پہلے توبہ کی توفیق بھی حاصل ہو جائے!
(حادثات اور قدرتی آفات میں جو لوگ اچانک مر جاتے ہیں انہیں اکثر توبہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔)

ایک مثال سے سمجھو

اسے ایک مثال سے سمجھو! فرض کرو تمہارا ایک غلام ہے۔ وہ سال بھر تو تمہیں اپنی نافرمانی سے ناراض رکھے اور سال کے ایک دن یا ایک ماہ تمہاری پسند کے کام سرانجام دے۔ تمہیں خوش کرنے کی کوشش کرے اور پھر کچھ عرصے بعد وہ اپنی پرانی روش کو اختیار کرلے تو تم اپنے اس غلام کو کس مرتبے پر رکھو گے۔ تمہاری نظر میں اس کی کیا وقعت ہوگی؟

اسی لیے مدت حیات کا علم انسان کو نہیں دیا گیا کہ انسان ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے کہ نہ جانے کب موت آجائے۔ یہ خوف اسے گناہوں سے دور رکھے گا۔

ہاں!...... تم نے صحیح سوچا کہ اب جبکہ مدتِ حیات کا کسی کو کوئی علم نہیں ہے کہ کس لمحے اسے موت آجائے گی، اس کے باوجود بھی لوگ بدکاریوں اور گناہوں سے باز نہیں آتے......

تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ اس معاملے میں تدبیر تو ایسی ہی کی گئی ہے کہ انسان گناہوں سے بچا رہے لیکن اگر کوئی

شخص اس کے باوجود گناہوں پر اصرار و تکرار کرے تو یہ اس کے مزاج کی بے اعتدالی اور دل کی سختی ہے۔ البتہ اس میں اصل تدبیر (پلاننگ) کی کوئی خرابی نہیں ہے"۔

مریض پرہیز ہی نہ کرے

"دیکھو! معالجین یا طبیب اپنے مریض کو پرہیز بھی بتاتے ہیں اور دوا بھی دیتے ہیں کہ فلاں فلاں چیز استعمال نہ کرنا اور اس دوا کو اس مقدار میں اور اتنے وقفے کے بعد استعمال کرنا تو انشاء اللہ تکلیف سے جان چھوٹ جائے گی۔ اب اگر مریض بتایا ہوا پرہیز نہ کرے، پابندی سے وقت پر دوا نہ استعمال کرے اور اس کا مرض بڑھتا ہی جائے تو اس میں طبیب، معالج یا دوا کا کیا قصور!

اور یہ بھی تو دیکھو کہ ایسی صورت میں کہ اسے معلوم نہیں کہ کس لمحے موت آ جائے گی اس کے باوجود وہ گناہوں سے باز نہیں آتا تو اگر اسے اپنی لمبی عمر کا علم (اور یقین) ہوتا تو اس کا کیا حال ہوتا؟

اب یہ انسان کو گناہوں سے بچانے کے لیے اللہ کی ایک تدبیر ہے تو جو اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے وہ نیک اعمال سرانجام دیتا ہے اور جو اس کے برعکس کام کرتا ہے تو برعکس انجام سے دوچار ہوتا ہے"۔

کچھ خواب سچے، کچھ خواب جھوٹے۔ ایسا کیوں؟

"مفضل! یہ جو رات میں یا دن میں نیند کی حالت میں خواب آتے ہیں، ان پر تم نے کبھی غور کیا؟ ان میں اللہ کی کیا مصلحت و مشیت ہے۔

کچھ خواب سچے کیوں ہوتے ہیں

اور زیادہ تر خواب جھوٹے اور بے معنی کیوں ہوتے ہیں؟

بات دراصل یہ ہے کہ اگر سارے ہی خواب سچے ہوا کرتے تو آدمی خود کو انبیاءؑ کے درجے پر سمجھتا اور اگر سارے ہی خواب بے معنی اور جھوٹے ہوتے تو ان کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اسی لیے سچے خوابوں کو جھوٹے خوابوں سے مخلوط کر دیا گیا ہے۔ تو کبھی تو خواب سچے ہوتے ہیں تاکہ انسان ان کے ذریعے اپنی زندگی میں، یا کاروبار میں فائدہ اٹھائے جس کے بارے میں اسے متوجہ کیا گیا ہے۔ جس نقصان سے بچنے کا اسے اشارہ کیا ہے، اس سے بچنے کی تدبیر کرے۔

جھوٹے خواب اس لیے سچے خوابوں میں شامل کر دیے جاتے ہیں کہ انسان ان پر پورا ہی بھروسا نہ کر لے اور ہر معاملے میں خوابوں کے انتظار میں نہ بیٹھا رہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اگر خواب سچے ہی ہوا کرتے تو لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے یا ان کے ذریعے نقصان سے بچنے کی تدبیر کر لیا کرتے تو پھر وہ اللہ

تعالیٰ کی ذات کی طرف کم ہی متوجہ ہوا کرتے (انہیں اپنی مشکل یا پریشانی میں دعا مانگنے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔)

نوٹ: خواب اور حقیقت

خواب دیکھنا انسان کی ایک انفرادیت ہے۔ دوسرے ذی حیات خواب نہیں دیکھتے لیکن یہ خواب آتے کہاں سے ہیں، یہ ہمارے بس میں کیوں نہیں ہوتے کہ ہم اپنی پسند کا خواب دیکھ سکیں۔ ہم خوابوں میں سفر کرتے ہیں۔ دوڑتے بھاگتے ہیں، رنگوں، خوشبوؤں، ذائقوں، لذتوں، چہروں، مقامات، اور آوازوں کو دیکھتے، سونگھتے، چکھتے، محسوس کرتے اور پہچانتے ہیں جب کہ نیند میں ہم بے حرکت پڑے ہوتے ہیں اور ہمارے پانچوں حواس معطل ہوتے ہیں۔

تو پھر ہم کن حواسوں سے سنتے، دیکھتے، چکھتے، محسوس کرتے، اور پہچانتے ہیں؟ وہ کون سے پاؤں ہیں جن سے ہم دوڑتے ہیں؟ ہم کس چیز کو کن ہاتھوں سے خواب کے عالم میں چھوتے ہیں؟ خواب میں ہم دشمن یا کسی خوفناک چیز سے ڈر کر بھاگتے ہیں تو آنکھ کھلنے پر ہماری سانس تیز تیز چل رہی ہوتی ہے، ہمارا دل بری طرح دھڑک رہا ہوتا ہے اگرچہ ہمارا جسم تو سکون سے بستر پر پڑا ہوتا ہے۔ ان سارے موضوعات پر غور کیا جانا چاہیے!

دنیا میں ضروریاتِ زندگی کی فراہمی

امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل ابن عمرؓ سے فرمایا:

"اب ذرا ایک سرسری سی نظر ڈالو ان چیزوں پر جو انسان کے لیے اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہیں اور یہ بھی دیکھو کہ انہیں کس طرح فراہم کیا گیا۔ سب سے پہلے تو مٹی کو دیکھو جس کے ذریعے مکان بنائے جاتے ہیں۔"

(مٹی نہ ہوتی تو کھیتی باڑی بھی ممکن نہیں تھی۔ فصلیں، نباتات، پھل، اناج، معدنیات، سب مٹی ہی سے حاصل ہوتی ہیں انسانوں اور جانوروں کے لیے تمام غذائی اجزاء زمین یا مٹی ہی میں پائے جاتے ہیں۔)

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"پھر اسی طرح پتھر، لکڑی، سونا چاندی، تانبا، جواہرات، اناج، پھل، پھول، گوشت، خوشبودار مصالحے، جڑی بوٹیاں، دوائیں، چوپائے، راکھ، چونا، ریت، ان کی تعداد، ان کے فائدے اور انہیں انسان کہاں کہاں استعمال میں لاتا ہے اس کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔

تو مفضل! ان سب چیزوں کی موجودگی بتاتی ہے کہ یہ خود بخود موجود نہیں ہوگئیں بلکہ ان کا کوئی پیدا کرنے والا ہے جس نے ہر چیز کو ایک خاص مقدار میں پیدا کیا اور بہت سی مصلحتوں اور حکمتوں (اور الگ الگ خصوصیات) کے ساتھ پیدا کیا اور ساتھ ہی اس نے انسان کو وہ فہم و فراست بھی عطا کی جس کے ذریعے وہ ان چیزوں کو مختلف مقامات سے حاصل کر سکے اور ان سے فائدہ اٹھا سکے۔

چیزیں مہیا کردی گئیں لیکن......

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ضرورت کی تمام چیزیں،

زمین پر مہیا کر دی ہیں۔ ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے اسے عقل عطا کر دی اور انہیں تلاش کرنے اور اپنے لیے قابلِ استفادہ بنانے کے لیے (عقل) ہاتھ، پیر، آنکھیں، کان وغیرہ، سب اسے دے دیے لیکن ان چیزوں کو بالکل تیار حالت میں پیدا نہیں کیا۔ ان چیزوں کو استعمال میں لانے کے قابل بنانا انسان کی ذمے داری قرار دی گئی۔

مثلاً اناج پیدا کیا گیا لیکن اسے صاف کرنے، پیسنے، آٹا بنانے اور روٹی پکانے کا کام انسان کو خود کرنا ہے۔ روئی تو موجود ہے لیکن اسے پودے سے نکالنے، دھنکنے، کاتنے اور پھر اس سے لباس بنانے کی ذمے داری انسان کی ہے۔

پھلوں کے درختوں کو خلق کیا گیا لیکن انھیں لگانا، بونا، ان کو سینچنا، ان کی نگہداشت انسان کے حوالے کر دی گئی۔ جڑی بوٹیاں پیدا کی گئیں لیکن مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر انہیں مختلف مقامات سے جمع کرنا، انہیں آپس میں ملا کر، رگڑ پیس کر، اُبال کر، عرق نکال کر ان سے دوائیں بنانا انسان کا اپنا کام ہے۔

اسی طرح معدنیات کو اللہ نے پیدا کیا لیکن انہیں پہاڑوں سے نکالنا اور ان سے فائدہ اٹھانا، انسان کی ذمہ داری ہے"۔

اگر تمام ضروریات تیار حالت میں مل جایا کرتیں......

"اب تم سوچو گے کہ اگر تمام چیزیں بالکل تیار حالت میں انسان کو مل جایا کرتیں، مثلاً پکی پکائی روٹی، لباس، جوتے، زیورات، ہتھیار، مکان، کشتی، یہ سب انسان کو تیار شدہ مل جایا کرتیں تو زیادہ بہتر ہوتا!

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر انسان کو اس کی تمام ضروریات کسی کوشش اور جدوجہد کے بغیر ہی حاصل ہو جاتیں تو انسان غرور و تکبر سے زمین پر پاؤں ہی نہ رکھتا اور ایسے کام کرنے لگتا جن سے اس کی تباہی و بربادی یقینی تھی۔ پھر یہ بھی ہے کہ اسے کسی شئے کی قدر و قیمت کا احساس ہی نہ ہوتا۔ کیوں کہ جو چیز بغیر محنت کے حاصل ہو جائے انسان اس کی قدر ہی نہیں کرتا۔

(اس کی ایک مثال تو ہمارے اعضاء ہی ہیں۔ ہمیں کسی عضو کی موجودگی کا احساس اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک اس میں کوئی خرابی پیدا نہ ہو جائے)

نوٹ: ایک مثال

اس کی ایک اور مثال اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت "ہوا" ہے۔ ہم ہر وقت اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہر وقت اس ہوا میں سانس لیتے ہیں لیکن ہمیں سانس لینے کا احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ سانس جو ہم لے رہے ہیں تو یہ آکسیجن ہمارے جسم میں جا کر ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی کتنی نعمتوں کو قابلِ استفادہ بنا رہی ہے۔ یہ ہوا اگر چند منٹ کے لیے ہمارے جسم کو فراہم نہ ہو سکے تو انسان معذور ہو سکتا

ہے یا اس کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ یہی آکسیجن جو ہم اپنی پہلی سانس سے آخری سانس تک بغیر کسی کوشش وجدوجہد کے استعمال کرتے رہتے ہیں، اگر کسی مریض کو مصنوعی طور پر فراہم کرنا پڑے تو وہ گیس کے سیلنڈر، ماسک اور دوسری طبی سہولتوں کی قدر و قیمت جان سکتا ہے۔ ہم دنیا میں آتے ہی اس ہوا کو استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اکثر لوگ دوسری دنیا میں جانے تک اللہ کی اس نعمت کی قدر و قیمت ہی سے بے خبر رہتے ہیں۔ شکر ادا کرنا تو دور کی بات ہے۔

انسان کام نہ کرتا تو بڑے مسائل پیدا ہو جاتے

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"مفضل! انسان کو کام کرنے والا پیدا کیا گیا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ اگر کسی شخص کے پاس کرنے کو کام نہ ہو تو اس کی زندگی کس قدر تلخ ہو جاتی ہے۔

پھر ضروریاتِ زندگی کی مختلف مقامات پر موجودگی، ان کی تلاش، ان سے مختلف اشیاء کی تیاری، ان کی بار برداری، فروخت اور حساب کتاب میں اللہ نے انسان کے لیے کام اور محنت کے ساتھ ساتھ اسبابِ رزق بھی پیدا کیے ہیں۔"

(مثلاً اگر کسی ملک کی تمام صنعتیں بند ہو جائیں تو کروڑوں لوگ بے روزگاری اور بھوک میں مبتلاء ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ بیروزگاری جرائم کو جنم دیتی ہے جس سے بدامنی اور خوف پھیلتا ہے۔)

پانی زیادہ پیدا کیا گیا

"مفضل! اس بات کو سمجھو کہ انسان کی اصل معاش و زندگی

روٹی پانی سے ہے۔ روٹی کی نسبت انسان کو پانی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ وہ بھوک کی نسبت پیاس پر زیادہ صبر نہیں کر سکتا۔ پانی دوسری ضروریات میں بھی کام آتا ہے۔ مثلاً نہانا دھونا، وضو کرنا، کپڑے دھونا۔ اسے دواؤں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے اور کھیتوں اور باغوں کو سینچنے میں بھی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے پانی کو فراواں مقدار میں پیدا کیا اور اس کے حصول کو بھی آسان بنایا۔"

(یعنی اسے پانی کو روٹی کی طرح "پکانا" نہیں پڑتا بلکہ اسے اسی حالت میں استعمال کیا جاتا ہے۔)

"تو دیکھو! کہ پانی کا حصول آسان اور روٹی کی فراہمی کو مشکل کس نے بنایا؟ کیا مادّے اور طبیعت (نیچر) میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ دنیا میں آنے والے انسان کی ضروریات (اور اس کے مزاج) کا اندازہ کر سکے اور پھر اس کے مطابق اشیاء کو پیدا کرے؟ ان حکمتوں اور باریکیوں کو وہی ذات سمجھ سکتی ہے جس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کی زندگی کے لیے دنیا میں سامان حیات فراہم کیے۔"

اس کے بعد امام علیہ السلام نے ایک بہت ہی حیران کن موضوع پر گفتگو فرمائی کہ ہر انسان کو ایک مختلف شکل وصورت پر کیوں پیدا کیا گیا؟ اس کی تفصیل وتشریح اگلے باب میں ملاحظہ فرمائیں۔

باب : 21

ہر انسان دوسرے سے مختلف کیوں؟

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اثبات وجودِ خدا کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے مفضل ابنِ عمرؓ کو ایک حیران کن موضوع کی طرف متوجہ فرمایا۔ یہ ایک ایسا موضوع تھا جس پر امامؑ سے صدیوں پہلے اور صدیوں بعد تک کرہ ارض پر موجود کسی فلسفی، حکیم، سائنس دان یا ماہر حیاتیات نے غور تک نہیں کیا تھا۔ اس سوال کا جواب سائنس دانوں کی سمجھ میں آنے کے اسباب 1953 میں DNA نامی مالیکیول کی دریافت کے بعد فراہم ہوئے۔ ہر انسان دوسرے انسان سے مختلف کیوں ہیں؟ اس کی وجوہات 2003ء کے بعد ماہرین حیاتیات کو معلوم ہونا شروع ہوئیں۔

(حوالہ: Genes & DNA)

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"مفضل کیا تم نے کبھی اس بات پر غور کیا کہ جانوروں کی شکلیں ایک سی ہوتی ہیں۔ (مثلاً کوے، چڑیاں، ہرن، ہاتھی، وغیرہ سب کی شکلیں ایک دوسرے کی کاپی ہوتی ہیں۔ ہم اور آپ انہیں الگ الگ نہیں پہچان سکتے۔)

تم ہرنوں کے گلے کو دیکھو، یا چکوروں یا تیتروں کے جھنڈ پر نظر ڈالو تو یہ سب ایک سے دکھائی دیں گے۔ تمہیں ان میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوگا۔

اس کے برعکس انسانوں کو دیکھو تو ہر ایک کی شکل و صورت

اور ساخت ایک دوسرے سے بالکل مختلف نظر آئے گی۔ یہاں تک کہ تمہیں دو آدمی بھی بالکل ایک شکل، قد و قامت (چال ڈھال، رنگ اور مزاج) کے شاید ہی نظر آئیں۔"

(یہ بات بھی وجودِ باری تعالیٰ کی واضح دلیل ہے کہ اس نے جانوروں کو ہم شکل اور انسانوں میں سے ہر انسان کو ایک دوسرے سے بالکل مختلف شکل و صورت پر پیدا کیا اور اس میں اس کی بڑی مصلحتیں ہیں جیسا کہ آپ آیندہ سطور میں پڑھیں گے)

ایسا کیوں ہوا؟

"تو مفضل! تم نے کبھی سوچا کہ ایسا کیوں ہے؟

"دیکھو مفضل! ہر انسان دوسرے انسان سے مختلف اس لیے ہے کہ انسانوں میں اس کی ضرورت ہے کہ ہر انسان کو الگ سے پہچانا جا سکے۔ ہر ایک کی الگ سے شناخت ہو سکے۔ انسانوں کے درمیان بہت سے باہمی معاملات ہوتے ہیں۔ لین دین ہوتا ہے اس لیے ہر انسان کو ایک الگ شناخت دی گئی۔ (مجرم اور معصوم، ظالم اور مظلوم، قرض دینے والے اور قرض لینے والے کو پہچاننا ہوتا ہے۔ پھر انسانوں کے درمیان حلال و حرام کے رشتے ہیں)

جانوروں میں ایسے معاملات نہیں ہیں۔ (وہ مکلف پیدا نہیں کیے گئے۔ جانوروں میں جزاء و سزا کا قانون نافذ نہیں ہوتا) اس لیے جانور اگر ایک دوسرے کے ہم شکل ہوں تو اس سے نظام زندگی میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا"۔

(نوٹ: جانور مثلاً کوے، چڑیاں، پنگوئن، ہرن وغیرہ اگر چہ ہمیں ایک جیسے نظر آتے ہیں لیکن یہ جانور آپس میں ایک دوسرے کو پہچاننے کی صلاحیت سے مالا مال ہوتے ہیں۔اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں دوسری طرح کی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔)

جڑواں بچے

امام علیہ السلام نے فرمایا:

''انسانوں میں اکثر جڑواں بچے ایک دوسرے کے بالکل ہم شکل پیدا ہوتے ہیں تو لوگوں کو ان سے لین دین یا دوسرے معاملات میں خاصی دشواری پیش آتی ہے۔

تو مفضل! ذرا اس بات کو سمجھو کہ کس نے بندوں اور دوسری مخلوقات کی تخلیق میں ایسی باریکیاں اور لطائف پیدا کیے جن کا کسی انسان کے ذہن میں تصور میں بھی آنا دشوار (بلکہ ناممکن) تھا۔کیا کوئی انسان خلقت کی ان باریکیوں کو کامل طور پر جان سکتا ہے۔کیا طبیعت (نیچر) میں یہ طاقت ہے کہ وہ ان باریکیوں کو سمجھ سکے اور پھر ان حکمتوں کو ضرورت و مواقع کے مطابق پیدا کر سکے! **لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔**

مفضل! اگر تم دیوار پر کسی آدمی کی تصویر بنی ہوئی دیکھو اور تم سے کوئی کہے کہ یہ تصویر خود بہ خود دیوار پر بن گئی ہے، کسی بنانے والے نے اسے نہیں بنایا۔تو کیا تم اس کی بات مان لو گے؟

یقیناً نہیں۔ بلکہ تم کہنے والے کی بات پر ہنسو گے۔ اس لیے

کہ تم جانتے ہو کہ انسان کی تصویر جو بے حس و حرکت ہوتی ہے وہ

بغیر کسی بنانے والے کے نہیں بن سکتی ....تو ایک زندہ، چلتا

پھرتا، عقل، ارادہ رکھنے والا، (عمل اور ردِعمل ظاہر کرنے والا)

انسان خود بہ خود کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ یقیناً انسان کو کسی نے پیدا

کیا ہے اور وہ اللہ کی ذات ہے جو احسن الخالقین ہے"۔

نوٹ: انسانوں کی شکلیں ایک دوسرے سے مختلف کیوں ہوتی ہیں؟

آیئے، اب جینٹک سائنس کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ انسانوں کی شکلیں کیوں مختلف ہوتی ہیں اور خلقت کی ان باریکیوں کے بارے میں سائنس دانوں کو کب معلومات حاصل ہوئیں۔ ان سوالوں کے جواب جاننے کے لیے ہمیں ایک سرسری نظر (DNA) ڈی این اے کی دریافت پر ڈالنا ہوگی۔

ڈی، این، اے کی دریافت کا سہرا دو امریکی سائنس دانوں جیمس واٹسن اور فرانسز کرک کے سر ہے۔ یہ دریافت انہوں نے 1953ء میں کی تھی۔ ان دونوں سائنس دانوں کو 1962ء میں ان کی اس دریافت پر نوبل پرائز سے سرفراز کیا گیا۔

حقیقت تو یہ ہے DNA کے حوالے سے ابتدائی غور و فکر اور تجربات آسٹریا کے ایک پادری گریگور جوہان مینڈل نے 1856ء میں مٹر کے مختلف رنگ کے پھولوں والے پودوں پر کیے تھے اور جینز Genes کا پتا لگا لیا تھا۔ مینڈل نے اپنے وقت میں انہیں فیکٹرز Factors کا نام دیا تھا۔ بعد میں انھیں Genes کا نام دے دیا گیا۔ اسی سبب سے اس کے کام کو جینیات کے علم کی بنیاد کہا جاتا ہے۔

جسم کی کتابِ ہدایت

سائنس کے طالب علم جانتے ہیں کہ ڈی این اے ایک مالیکیول ہے۔ مالیکیول بہت سے Atoms یعنی ذرات سے مل کر بنتا ہے۔ ڈی۔ این۔ اے مالیکیول بھی مختلف اقسام کے ایٹموں سے مل کر بنتا ہے۔

ڈی این اے تمام ذی حیات کے خلیوں میں پایا جاتا ہے۔ اسے آپ کسی بھی ذی حیات کے اندر ایک کتاب ہدایت کی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ یہ کتاب کیمیائی حروف سے لکھی جاتی ہے۔ حروف سے لفظ بنتے ہیں، الفاظ سے جملے، جملوں سے پیراگراف اور پیراگرافوں کے مجموعے سے پوری کتاب وجود میں آجاتی ہے۔

انسانی ڈی این اے پر ساری تحریریں چار حروف سے لکھی گئی ہیں اور یہ حروف ہیں A.T.G.C۔ جسم کی کتاب ہدایت میں ہر لفظ ان میں سے کسی بھی ''تین حروف'' (یعنی کیمیکلز) سے مل کر بنتا ہے۔ یہ لفظ دراصل ایک کوڈ یعنی خفیہ پیغام یا خفیہ حکم ہوتا ہے۔ ایسے کئی احکامات کے مطابق ایک خاص طرح کی پروٹین بنتی ہے۔ ڈی این اے کی چار بیس Base ہیں۔ بیس دراصل انہی چار حروف یعنی A.T.G.C کو کہا جاتا ہے۔ یہ حروف ایڈی نین، سائٹوسین، گوانین، اور تھائی مائن نامی کیمیکلز کے ناموں کے ابتدائی حروف ہیں یعنی ڈی، این، اے کی چار کیمیائی بنیادیں۔

انسانی خلیے میں جینوم (ڈی این اے) دو میٹر لمبا اور حد بصارت سے بالاتر ہوتا ہے۔ اس کے اندر A,T اور G.C جیسے لاکھوں کروڑوں جوڑے (pairs) ہوتے ہیں۔ ان لاکھوں کروڑوں جوڑوں کو پڑھنا اور ان سے بننے والے کیمیائی پیغامات، الفاظ یا ہدایات کو سمجھنا آسان کام نہیں تھا اسی لیے 1990ء میں اس پروجیکٹ کا آغاز بیک وقت چھ ممالک میں سولہ ریسرچ سینٹرز کے قیام سے کیا گیا۔ ان سولہ ریسرچ سینٹرز میں سینکڑوں سائنس دانوں نے شب و روز کام کرنا شروع کیا۔

ہیومین جینوم پراجیکٹ نے کیا معلوم کیا؟

اس تحقیق کے نتائج سے پہلی بار یہ بات معلوم ہوئی کہ انسانی جینوم یعنی DNA میں 32 کھرب بیس پیئر پائے جاتے ہیں جب کہ جینز یا ہدایات کی تعداد 30000 ہزار سے 40000 ہوتی ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ یہ تمام جینز DNA کے صرف تین فیصد حصے پر پائی جاتی ہیں۔ باقی 97% DNA کو ماضی میں سائنس دانوں نے ''جنک ڈی این اے'' کا نام دیا تھا یعنی کچرا DNA لیکن بعد کی تحقیقات سے یہ بات عیاں ہو چکی ہے کہ اسی بظاہر بے کار DNA کا کچھ حصہ جینز کو بتاتا ہے کہ کس خلیے میں اور کن حالات میں اسے کیا کام کرنا ہے اور کس رفتار سے کرنا ہے یا سرے سے خاموش ہی رہنا ہے۔

ذرا سے اختلاف سے کتنے چہرے، کتنے رنگ

بیس پیئر یعنی بنیادی جوڑوں کا مطلب تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ ڈی این اے کے دہرے دھاگوں پر ایک دوسرے کے سامنے چار میں سے کوئی ایک کیمیکل موجود ہوتا ہے۔ ان آمنے سامنے والے کیمیکلز ہی کو بیس (Base) اور ان دونوں کو ملا کر بیس پیئر (Base Pair) کہا جاتا ہے۔

تحقیق سے یہ حیران کن حقیقت بھی سامنے آئی کہ ڈی، این، اے میں بیس پیئرز کی ترتیب تمام انسانوں میں 99.1% یکساں ہوتی ہے۔ اسی لیے ہزار طرح کے تضادات کے باوجود انسان انسان ہی نظر آتا ہے۔ چہروں، شکلوں، رنگوں، لہجوں، مزاجوں، کے اندر جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کا سبب 32 کھرب بیس پیئرز کی ترتیب میں 0.1% فیصد اختلاف ہے۔

ہم آپ کو یہ بھی بتا دیں کہ 99.9 فی صد جینز تمام انسانوں میں یکساں ہوتی ہے۔ 98.5 فی صد جینز انسانوں اور گوریلا نسل کے بندروں میں مشترک ہوتی ہیں۔ 90 فی صد جینز انسانوں اور چوہوں میں ایک سی ہوتی ہیں اور 7 فی صد جینز بیکٹیریا اور انسانوں میں یکساں پائی جاتی ہیں۔ (اقتباس: DNA جسم کی کتاب ہدایت)

آپ نے دیکھا کہ امام علیہ السلام نے انسانوں کی شکل وصورت میں اختلاف کی طرف کم و بیش ساڑھے تیرہ سو سال پہلے انسانوں کو متوجہ کیا تھا۔ امامؑ کے دور سے کم و بیش ہزار سال کے بعد مغربی دنیا کے سائنس دانوں نے اس موضوع پر کام کیا اور انسانوں کی شکل وصورت، عادات و اطوار چال، ڈھال، رنگوں اور مزاجوں میں اختلاف کے اسباب معلوم کیے۔

ہمارا ایمان ہے کہ امام معصومؑ ہر چیز کی حقیقت، ہر شے کی بنیاد اور ہر شے کے ظاہر و باطن سے آگاہ ہوتے ہیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام تمام حقائق سے واقف تھے لیکن کیا یہ سائنسی معلومات جو آج سے ہزار سال قبل امام علیہ السلام کو معلوم تھی، انھیں آج سے ہزار سال پہلے کسی انسان کے سامنے بیان کیا جا سکتا تھا؟

باب : 22

جانداروں کے جسم ایک مخصوص حد کے بعد کیوں نہیں بڑھتے!

امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل ابنِ عمرؓ کو ایک حیران کن سوال کی طرف متوجہ کیا یہ ایک ایسا سوال تھا جس کے بارے میں اٹھارویں صدی عیسوی تک دنیا میں کسی نے غور نہیں کیا تھا۔

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"مفضل تم نے کبھی سوچا کہ انسان ہوں یا دوسرے جاندار یہ پہلے بچے ہوتے ہیں پھر ان کے جسم میں نشوونما ہوتی رہتی ہے لیکن ایک خاص حد کے بعد ان کے جسموں (مثلاً قد و قامت) کا بڑھنا رک جاتا ہے حالانکہ وہ ہر طرح کی غذائیں اسی طرح کھاتے رہتے ہیں لیکن ایک خاص حد کے بعد ان کے جسم (یعنی قد و قامت) میں اضافہ نہیں ہوتا۔

اس میں حکیم مطلق کی "تدبیر" یہ ہے کہ حیوانات کی ہر قسم اور نسل کے جسموں کا قد و قامت ایک مخصوص حد تک رہے۔ یہ نہ کم ہو، نہ زیادہ، اگر یہ اجسام بڑھتے ہی رہتے تو ان کی کوئی حد نہ رہتی حتیٰ کہ ان کی پہچان باقی نہ رہتی۔

نوٹ: عظیم معجزہ

آیئے ایک نظر ڈالتے ہیں کہ وہ کون سا نظام ہے جو ہمارے قد و قامت کا تعین کرتا ہے، اس کام کی نگرانی کرتا ہے اور ہمارے قد و قامت کو ایک حد تک پہنچنے کے بعد مزید بڑھنے سے روک دیتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس کے لیے ''تدبیر'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اس لیے کہ ساتویں صدی عیسوی کے دور میں وہ باتیں ایک عام انسان کے تصور سے بھی بالاتر تھیں جنہیں مغربی دنیا کے ماہرین حیاتیات نے گزشتہ تین چار سو سال میں اپنے مسلسل تجربات، مشاہدات، اور جدید سائنسی آلات کی ایجاد کے بعد معلوم کیا۔ لیکن آج بھی ان کا کہنا ہے کہ ہم نے جسم انسانی کے بارے میں بہت کچھ معلوم کیا ہے لیکن درحقیقت بہت کم معلوم کیا ہے۔

جسم انسانی کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کئی مقامات پر امامؑ نے لفظ ''تدبیر'' کہنے پر اکتفا فرمایا۔ اس لیے کہ آپ اگرچہ سب کچھ جانتے تھے لیکن جو کچھ جانتے تھے اسے سمجھانے کے لیے سننے والے افراد میں اس ذہنی صلاحیت کا ہونا ضروری تھا جس کے ذریعے وہ علم کی گہرائیوں اور باریکیوں کو سمجھ سکیں۔

بہر حال میڈیکل سائنس کی روشنی میں امامؑ کے کام کی گہرائیوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ امام علیہ السلام کے اس مختصر اور جامع کلام کی تشریح کے لیے ہمیں DNA، دماغ، اعصابی نظام اور غدود کے حیران کن نظام پر نظر ڈالنا ہوگی۔ پہلے ڈی این اے کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔

قدوقامت...... DNA کی ہدایات کے مطابق

انسان کی تخلیق کا آغاز ماں باپ کے 23-23 کروموسومز والے دو نامکمل خلیوں کے ملنے سے ہوتا ہے۔ عام خلیوں میں 46 کروموسومز ہوتے ہیں۔ دو تولیدی نصف خلیوں کے ملنے سے 46 کروموسومز کا خلیہ بنتا ہے۔ اس خلیے کو کیا کرنا، کس طرح کرنا، کیا بنانا ہے، کس طرح بنانا ہے، خام مال کہاں سے آئے گا۔ کس طرح آئے گا۔ اس نئے پیدا ہونے والے انسان کے اعضاء کس طرح بنیں گے، کس میٹریل سے بنیں گے، کہاں لگیں گے، کب کام کرنا شروع کریں گے، اس کی ہڈیاں کس مادے سے تیار ہوں گی اور کب مکمل ہو کر مزید بڑھنا بند ہو جائیں گی۔

اس نئے انسان کے بالوں، آنکھوں اور جلد کا رنگ کیسا ہوگا، اس کی چال ڈھال، مزاج کیسا ہوگا، ننھیال اور ددھیال کی کون کون سی خصوصیات اس کی زندگی میں آئیں گی، اسے کون سی

بیماریاں لاحق ہوں گی۔ یہ اور ان کے علاوہ ہزاروں باتیں اس بارآور تولیدی خلیے کے ڈی این اے کے ماں باپ کی طرف سے آنے والے دودھاگوں پر کوڈز کی شکل میں لکھی ہوتی ہیں۔

یہ بارآور خلیہ رحم مادر کی دیوار سے چپکتا ہے تو نئی زندگی کا آغاز ہوجاتا ہے۔ رحم مادر کی دیوار سے اس خلیے کو توانائی حاصل ہوتی ہے۔ اس توانائی کی مدد سے یہ خلیہ (جو حد بصارت میں بھی بہ مشکل داخل ہوتا ہے۔) اپنے اندر موجود پروگراموں کو کسی کمپیوٹر کی طرح کھولنا شروع کرتا ہے۔ مختلف پروگرام، ونڈوز، اور کمانڈز کام کرنے لگتی ہیں۔

یہ خلیہ ایک سے دو۔ دو سے چار، پھر آٹھ، سولہ، بتیس ہوتے ہوتے کھربوں خلیوں میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اور اس میں موجود ڈی این اے جو اس کی تخلیق کا نقشہ ہے ہر خلیے میں کاپی ہوتا رہتا ہے۔ (البتہ خون کے سرخ خلیوں میں ڈی این اے کاپی نہیں ہوتا کیونکہ انہیں کچھ بنانا نہیں ہوتا۔)

یہ کھربوں خلیے مختلف اعضاء کو بناتے ہیں اور ڈی این اے کی ہدایات کے مطابق بناتے ہیں اور نو ماہ یا اس سے کم مدت میں ایک نوزائیدہ انسان دنیا میں آنکھ کھولتا ہے لیکن اس کے بعد بھی اس کے جسم کی تعمیر ڈی این اے کی ہدایات کے مطابق جاری رہتی ہے۔ اور جب اس کا جسم مکمل، بالغ ہوجاتا ہے تو 21 سال کی عمر میں ڈی این اے کی ہدایات کے مطابق اس کی ہڈیاں بڑھنا رک جاتی ہیں۔ البتہ ڈی این اے کی نگرانی میں جسم کی ٹوٹ پھوٹ کو ٹھیک کرنے اور اس کی نگرانی کا کام زندگی کی آخری سانس تک جاری رہتا ہے۔

اعصابی نظام

اعضاء کے مکمل ہوجانے کے بعد ہمارے جسم کی دنیا میں ہر لمحے، قدرت کے ہزاروں معجزے رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ان سارے برقی کیمیائی، یا میکینکل کاموں کو سرانجام دینے میں ہمارے جسم کے اندر موجود 2 مختلف نظام کام کرتے ہیں۔ ایک اعصابی نظام اور دوسرا غدود (یعنی گلینڈز اور ہارمونز) کا نظام جسے انڈوکرائن سسٹم کہا جاتا ہے۔

اعصابی نظام جسم کی ضروریات یا کسی ایمرجینسی کی صورت حال سے دماغ کو آگاہ کرتا رہتا ہے اور دماغ کے احکامات کو جسم کے ایک ایک خلیے اور عضو تک پہنچاتا ہے۔ جسم کے اعضاء دماغ کے احکامات پر عمل کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

غدود کا نظام

آپ کے اردگرد درجۂ حرارت بڑھتا ہے تو جلد کے اندر موجود اعصابی نظام اس کی اطلاع دماغ کو فراہم کرتا ہے۔ دماغ کے اندر موجود ہائی پوتھیلی مَس جلد کا درجہ حرارت کم کرنے کے لیے مطلوبہ ضروریات کا اندازہ لگا کر دماغ میں موجود پیچوٹری گلینڈ کو اس کی اطلاع دیتا ہے۔ پیچوٹری گلینڈ ایک ہارمون جاری کرتا ہے۔ جو سیکنڈوں کے اندر جلد پر پھیلے ہوئے پسینے کے بیس لاکھ غدود تک پہنچتا ہے۔

اس ہارمون میں پسینے کے غدود کے لیے یہ حکم موجود ہوتا ہے کہ وہ اپنے پانی کے ذخائر کا منہ کھول دیں۔ اس کے ساتھ ہی پانی آپ کے مسامات سے باہر نکلنے لگتا ہے آپ کو پسینہ آنے لگتا ہے اور باہر کی ہوا اور پانی کی مدد سے آپ کی جلد ٹھنڈی ہونے لگتی ہے۔

اسی طرح اعصابی نظام دماغ کو بتاتا ہے کہ دورانِ خون گاڑھا ہو رہا ہے تو دماغ دوسری طرح کا ہارمون جاری کرتا ہے اور آپ کو پیاس لگنے لگتی ہے۔ ایسا ہی بھوک کے معاملے میں ہوتا ہے۔

حیران کن بات یہ ہے کہ دماغ اعصابی نظام کے ذریعے چوبیس گھنٹے پورے جسم کی نگرانی کرتا ہے اور تمام بیرونی اور اندرونی اعضاء ہر لمحہ چیک اینڈ بیلنس کے اس نظام کی نگرانی میں کام کرتے ہیں۔

اعضاء کے سائز کو کس طرح کنٹرول کیا جاتا ہے؟

اعضاء کی نشوونما کے لیے بھی یہی حیران کن نظام چوبیس گھنٹے کام کرتے ہیں۔ جسم کو اس کی ضروریات کی فراہمی کے لیے بھی یہی دونوں نظام ہر لمحہ تیار رہتے ہیں۔ اگر یہ نظام کام کرنا بند کر

دیں یا اعتدال کے ساتھ کام نہ کریں تو انسان کا قد وقامت کسی بچے کی طرح بہت مختصر بھی ہو سکتا ہے اور کسی دیوزاد کی طرح بہت زیادہ لمبا بھی۔ آپ اخبارات میں طویل القامت، یا پستہ قد افراد کے بارے میں پڑھتے ہیں تو اس کا سبب دراصل ان کے ڈی این اے کی کسی خاص جین (GENE) یا دماغ میں موجود پیچوٹری گلینڈ میں کوئی خرابی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ نشوونما سے متعلق ہارمون کو اعتدال سے زیادہ یا کم خارج کرنے لگتا ہے۔

انسان کو تکلیف کیوں محسوس ہوتی ہے؟

اب ہم دوبارہ امام علیہ السلام کے کلام بلاغت کی طرف لوٹتے ہیں۔

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"تم نے سوچا مفضل! کہ انسان کو تکلیف کیوں محسوس ہوتی ہے۔ دیکھو! کام کاج کرنے سے آدمی تھک جاتا ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ اس نے ضروریات زندگی کی فراہمی کے لیے محنت مشقت کی ہے (اس طرح اسے محنت سے کمائی ہوئی آمدنی کو استعمال کرنے میں خوشی حاصل ہوتی ہے۔)

اور یہ بھی ہے کہ اگر انسان کو درد یا تکلیف محسوس نہ ہوا کرتی تو وہ متکبر ہو جاتا۔ ایسی صورت میں اس کا نفس اسے بدکاریوں اور گناہوں کی طرف متوجہ کرتا۔ خوفِ خدا اس کے دل سے نکل جاتا۔ وہ نہ اللہ کے سامنے جھکتا اور نہ لوگوں پر مہربان ہوتا۔

اسی لیے جب کوئی شخص کسی درد یا تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو اللہ کی بارگاہ سے رجوع کرتا ہے۔ خضوع وخشوع کے ساتھ اپنا

سر جھکا دیتا ہے۔ صدقہ و خیرات کرنے لگتا ہے اور اپنے پروردگار سے درد اور تکلیف کے دور ہونے کے لیے دعائیں مانگتا ہے۔"

(دوسروں سے اس کا رویہ اگر پہلے متکبرانہ تھا تو بیماری کی صورت میں عاجزانہ ہو جاتا ہے۔)

"دیکھو مفضل! انسان میں درد اور تکلیف کو محسوس کرنے کی صلاحیت کے اور بھی بے شمار فوائد ہیں، اس کے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی، مثلاً اگر انسان کو تکلیف ہی نہ ہوا کرتی تو مجرموں کو ان کے جرم کی سزا کیسے دی جاتی۔ (آپ لاکھ کوڑے مارتے رہیں لیکن کوڑے کھانے والے کو تکلیف ہی نہ ہوتی وہ مزے سے کوڑے کھاتا رہتا) اسی طرح بچے کسی سزا سے نہ ڈرتے تو وہ مختلف علوم کس طرح سیکھتے!

نوٹ: درد یا تکلیف ہم کس طرح محسوس کرتے ہیں؟

ہمارے جسم کے بیرونی اور اندرونی حصوں میں ہر جگہ اعصابی خلیے موجود ہیں جو جسم کے اندر ہونے والی تکلیف، یا جسم پر لگنے والی چوٹ کی اطلاع ہر لمحے دماغ کو فراہم کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ہماری جلد پر مختلف اقسام کے دباؤ، کو محسوس کرنے والے اعصاب ہیں جن کی مدد سے آپ پتھر کے وزن سے لے کر ایک مچھر یا چیونٹی تک کا وزن محسوس کر سکتے ہیں۔

یہ اعصابی نظام ہر تکلیف کی اطلاع دماغ کو فراہم کرتا ہے۔ دماغ ان اطلاعات کی بنیاد پر اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے اور اس سے بچاؤ کی تدبیر کرتا ہے ان تدابیر میں پٹھوں کا سخت ہو جانا اور جسم کا مختلف زاویوں پر مڑنا شامل ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے جسم کے ہر حصے کی تکلیف دماغ محسوس کرتا ہے لیکن خود دماغ کے بعض آپریشن ایسے ہوتے ہیں کہ مریض ہوش میں ہوتا ہے لیکن اسے کسی قسم کی بھی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔

درد اور تکلیف محسوس کرنے کی یہ صلاحیت اللہ کی عظیم نعمتوں میں سے ہے اس لیے کہ اگر انسان درد یا تکلیف محسوس نہ کرے تو وہ معالج سے شاید ہی رجوع کرے۔ اسے معلوم ہی نہیں ہو سکے گا کہ اس کے جسم میں کیا خرابی پیدا ہو رہی ہے جس کا علاج نہ کرایا گیا تو یہ بیماری اس کی مدت زندگی کو وقت سے پہلے ختم کر سکتی ہے۔

اسی طرح بھوک، پیاس، یا جسم کی دوسری خواہشات کا احساس ہونا بھی دماغ سے جسم اور جسم کے دماغ کے درمیان پھیلے ہوئے اعصابی نظام ہی کے سبب ممکن ہوتا ہے۔

درد اور تکلیف اللہ کی مصلحت

امام جعفر صادقؑ نے درد اور تکلیف کی حکمت بیان کرنے کے بعد مفضل ابن عمرؒ سے فرمایا:

> ''درد و تکلیف کے کیا فائدے ہیں، وہ میں نے تم سے بیان کیے۔ ابن ابی العوجا جیسے خدا کو نہ ماننے والوں کا کہنا ہے کہ دنیا میں جو کچھ پیدا ہوا، وہ بغیر کسی خالق و مدبّر کے پیدا ہو گیا۔ ان کے جاہلانہ خیالات کے مطابق انسان کو جو درد یا تکلیف ہوتی ہے اس میں حکمت و مصلحت نہیں ہے جب کہ درد اور تکلیف کے اپنے فائدے ہیں جو میں تم سے بیان کر چکا۔
>
> میں نے اب تک صرف انسان کے جسم کے اندر موجود، حیران کن اعضاء ان کی کارکردگی، ان اعضاء کے درمیان باہمی رابطے، جن کے ذریعے انسان کی زندگی برقرار رہتی ہے، ان سب کے بارے میں تمہارے سامنے جو حقائق بیان کیے وہی ایسے ہیں کہ اگر کوئی آدمی ان پر غور کرلے تو اسے معلوم ہو جائے

گا کہ یہ سب کچھ ایسے ہی پیدا نہیں ہو گیا۔

اس کے پیچھے ایک خالق کی ذات ہے جس نے انسانی زندگی اور اس کی ضروریات کے مطابق انسانی جسم کو خلق فرمایا ہے۔

میرے بیان کی روشنی میں تم اگر غور کرو گے تو معلوم ہو گا کہ اللہ تعالیٰ عزوجل کی ہر تدبیر (پلاننگ، منصوبہ بندی) بے خطا ہوتی ہے۔ اس میں کہیں کوئی غلطی، بھول چوک نظر نہیں آتی، یہاں جس چیز کی جس قدر ضرورت ہوتی ہے، وہ مہیا رہتی ہے اور جس کی ضرورت نہیں ہوتی وہ مہیا نہیں کی جاتی......''

مفضل ابنِ عمرؓ کہتے ہیں کہ امامؑ کی گفتگو ابھی جاری تھی کہ زوال کا وقت آ گیا۔ آقا امام جعفر صادق علیہ السلام نماز کے لیے اٹھے اور فرمایا:

''مفضل! اب تم کل صبح اسی وقت میرے پاس آ جانا۔ کل میں تمہارے سامنے انشاء اللہ حیوانوں، درندوں اور پرندوں کی ساخت، ان کی خلقت میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں اور مصلحتیں بیان کروں گا۔

مفضل ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ امامؑ کی جانب سے ان معلومات کے حاصل کرنے سے مجھے انتہائی خوشی محسوس ہوئی اور علم کی جو نعمت مجھے حاصل ہوئی تھی اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوا گھر واپس آیا کہ آقا علیہ السلام نے مجھے کیا کچھ عطا نہیں کیا اور کیا کیا چیزیں ہیں جو مجھے تعلیم نہیں دیں۔

....

توحید مفضل کی ان تین جلدوں کی سائنسی تشریحات کے لیے درج ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

- HOW THE BODY WORKS by Steve parker.
- Amazing Book Of Facts published by mike kelly publishing ltd. china
- Junior Science Encyclopedia By Keith Solomon
- I Am Geo's Body By J.D Radcliffe
- Reproduction And Heredity by Regency Publishing
- How Nature Works By David Burnie
- Medicine by Steve parker
- The Natural World By Heather Amery
- Facts And Records By Kingfisher Publisher Newyork
- Brain By Richard Walker
- Microlife By David Burnie
- The Universe by Time-Life Books (USA)
- The Way Nature Works by Macmillan publishing company new york
- How The Earth Works By John Farndon
- Stars And Planets by Ian Ridpath
- The Weather By dick File
- Ecology By Steve Pollock
- Earth By Susanna van Rose
- Outer Space By Harry Ford And Kay Barnham
- Desert By Miranda Macquitty
- Insect By Laurence Mound
- The Five Ages Of Universe by Fred Adams And Greg Laughlin
- Genes And DNA By Richard Walker
- Jism Kay Ajaibaat By Muhammad Ali Syed
- D.N.A Jism Ki Kitaab E Hidayat By Muhammad Ali Syed